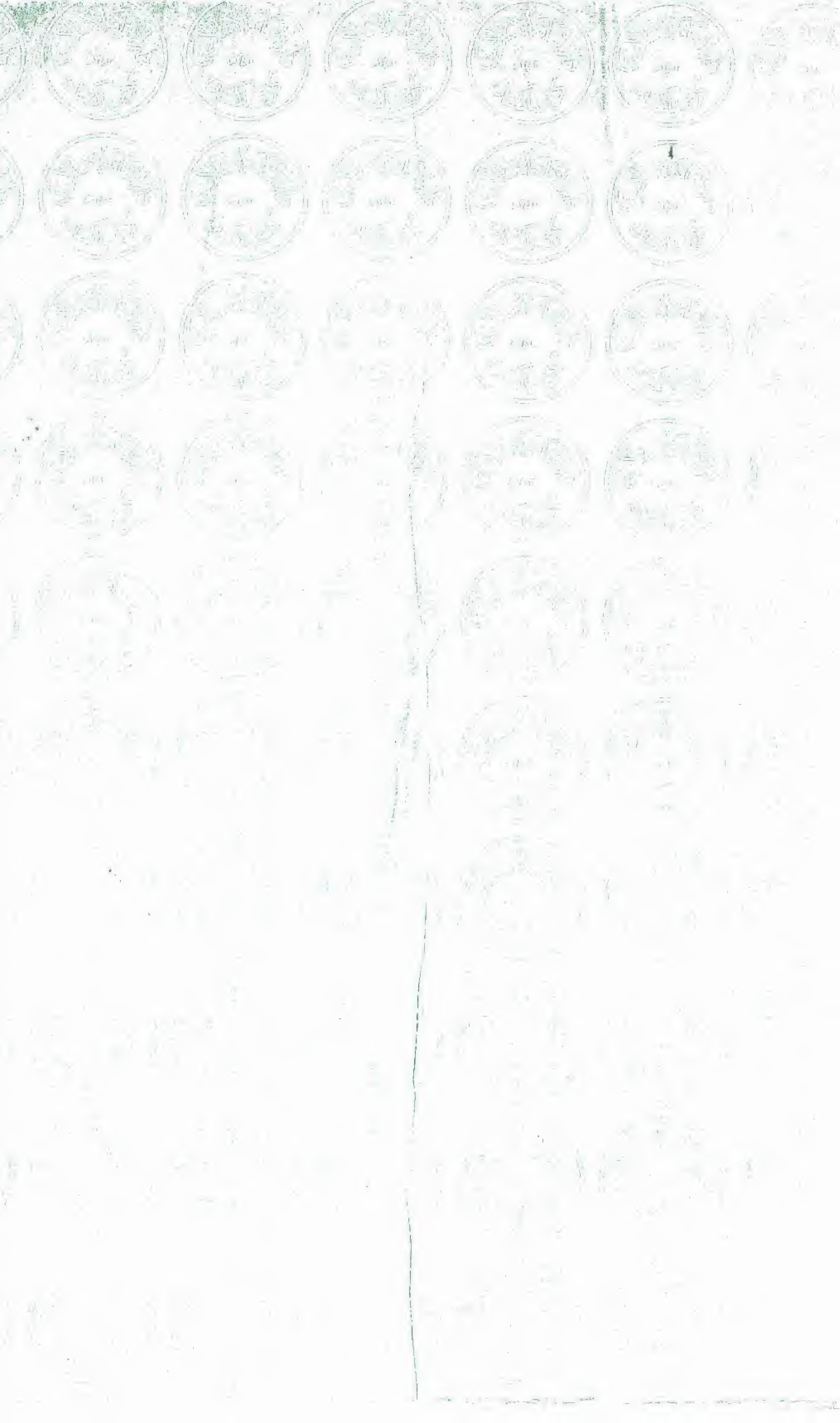
عنوانِ عاشورا



دار الثقافۃ الاسلامیۃ پاکستان




8027


بسم اللہ الرحمن الرحیم

عنوان عاشورا

مقالہ نگاران

★ آیت اللہ شہید سید محمد باقر الصدر (علیہ الرحمۃ)

★ آیت اللہ شہید سید محمد حسین بہشتی (علیہ الرحمۃ)

★ آیت اللہ مفتی سید آغا جزائری

★ سید علی شرف الدین موسوی

★ حجۃ الاسلام رسول جعفریان

★ سید حسنین رضوی کراروی

اسم کتاب .... عنوان عاشورا
مؤلف .... مقالہ نگاران
تصحیح و ترتیب .... رسالت حسین کوثر
حسنین حیدر عابدی، سید محمد سعید موسوی
کمپوزنگ .... سید محمد صادق شرف الدین
ناشر .... دار الثقافہ الاسلامیۃ پاکستان
طبع اول .... ذی القعدہ ۱۴۲۲ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تمہید

الحمدلله الذی جعلنا من المتمسکین بالقرآن العظیم وبنبیهٖ و صفیّهٖ ونجیبهٖ وحبیبه سیدنا وامامنا وامام الانبیاء والائمة المعصومین محمد وعترته الطاهرین صلواة الله وصلٰواة المصلین نَتبرأ من اعدائهم واعداءِ الله اجمعین مِنَ الآن الیٰ قیام یوم الدین۔

ہم جس عقیدت و محبت اور انہماک سے، نمناک آنکھوں اور پر درد دل کے ساتھ عاشورہ مناتے ہیں اسی عقیدت و محبت اور توجہ کے ساتھ یہ جاننے کی کوشش بھی کرنی چاہئے کہ عنوان عاشورہ سے کیا مراد ہے۔

یہ بات مشاہدے میں آئی ہے کہ کسی بھی چیز، شخصیت یا نظریہ سے عقیدت و محبت کے اظہار کیلئے ہر ملک، قوم، مذہب یا مسلک کے انداز اور طریقے نہ صرف یہ کہ جدا جدا اور مختلف ہیں بلکہ بعض اوقات ان میں اس قدر زیادہ فرق نظر آتا ہے کہ ایک ہی مذہب یا مسلک کا اگر دوسرے ملک یا دوسرے علاقہ میں جا کر مشاہدہ کریں تو وہی مذہب یا مسلک کئی مذہبوں یا مسلکوں اور فرقوں میں بدلتا نظر آتا ہے

اور یہ بات کسی بھی مذہب کیلئے انتہائی نقصان دہ ہوتی ہے۔

ہم دنیا بھر میں عاشورہ مناتے ہیں۔ یہ کربناک سانحہ اور دفاع شریعت کیلئے منفرد، ہوشربا انداز سے قیام تاریخ بشریت نے نہ پہلے دیکھا تھا نہ آئندہ ایسی بے نظیر قربانیوں اور قیام کی مثال مل سکتی ہے۔ لہٰذا عاشورہ ایک ہی ہے۔ اس کے اہداف اور اغراض و مقاصد بھی وہی ہیں جنہیں امام حسینؑ نے متعارف کروایا۔ اس لئے ضروری ہے کہ دنیا بھر میں عاشورہ کا ایک ہی رنگ ہو اور اہداف و مقاصد بھی ایک جیسے ہوں کیونکہ اگر علاقے اور ملک کے الگ ہونے سے عاشورہ اور قیام امام حسینؑ کے اہداف و مقاصد بھی الگ الگ ہوتے جائیں تو یہ بات اسلام اور شریعت محمدیؐ کیلئے بہت نقصان دہ ثابت ہوگی۔ پس مسلمانان عالم بالخصوص اہل تشیع پر واجب ہے کہ وہ عنوان عاشورہ کی معرفت اور آگاہی کیلئے خصوصی کوشش اور تحقیق کریں۔ چونکہ قیام امام حسینؑ کے مختلف اور متصادم اغراض و مقاصد اور عاشورہ منانے کے جدا جدا طریقوں میں صحیح اور درست طریقہ تو بس ایک ہی ہوگا۔ لہٰذا ہمارا فرض ہے کہ اس ایک طریق کو تلاش کرنے کیلئے مخلصانہ کوشش کریں۔

اگر ہم محققین علمائے کرام کے افکار و نظریات سے آگاہی حاصل کرنے کی کوشش کریں، مستند و معتبر کتب تاریخ و مقاتل و سیر کا مطالعہ کریں اور قرآن حکیم میں موجود خداوند متعال کے حکم کو مانتے ہوئے فکر و تدبر سے کام لیں، تو معلوم ہوگا کہ عنوان عاشورہ یہ ہے کہ امام حسینؑ چاہتے تھے کہ دین اسلام کے اصول و فروع کو بچائیں اور اس کے مصادر و مآخذ یعنی قرآن کریم اور سنت کا برملا مذاق اڑانے والوں، دور جاہلیت کے شکل کو واپس لانے کے خواب دیکھنے والوں کے خواب کو خاک میں ملالیں اور اس ظالمانہ، جاہلانہ اور قبائلی تعصبات اور کافرانہ و مشرکانہ فکر و عمل کے تاریک ترین دور کے دوبارہ برگشت کے عزائم رکھنے والوں

کے چہروں سے نقاب ہٹائیں' امت مسلمہ کو ان حکمرانوں کے خطرناک عزائم سے آگاہ کریں' ان کے چہرۂ منافقت سے آگاہ و آشنا کریں اور ان کے اسلام دشمن عزائم کو خاک میں ملانے کی بھرپور جدوجہد کریں۔

امام حسینؑ چاہتے تھے کہ لوگوں پر یہ بات واضح ہو جائے کہ جب بھی کسی گروہ یا شخص کی طرف سے شریعت رسول مقبولؐ میں ذرّہ برابر بھی تبدیلی یا انحراف کو داخل کرتے دیکھیں تو آپؑ کے فکر و عمل سے سبق سیکھتے ہوئے دین اسلام اور شریعت محمدیؐ میں ان نت نئی تبدیلیوں' انحرافات اور خرافات کے خلاف عملاً اٹھ کھڑے ہوں۔ چاہے یہ انحرافات و خرافات اسلام اور محمدؐ و آل محمدؐ سے عقیدت و محبت کے اظہار ہی کے نام پر کیوں نہ ہوں کیونکہ محمدؐ و آل محمدؐ سے محبت و مودت کے اظہار کیلئے شریعت محمدیؐ میں تبدیلی اور انحراف کے مظاہرے' یا کسی رنگ برنگے میلے کا سماں باندھنے اور جشن کے نام پر پٹاخوں اور ہاہو کے شور و غوغا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ بے ترتیبی اور بدنظمی سے مساجد و امام بارگاہوں اور تبلیغی و اصلاحی و احتجاجی مقاصد کی خاطر نکالے جانے والے جلوسوں کے تقدس کو پامال کرنے والی حرکات و سکنات کی ضرورت نہیں بلکہ ہر جگہ خود ان معصوم ہستیوں کے احکامات اور عمل کی روشنی میں ان کی اطاعت و پیروی کی ضرورت ہے۔ امام حسینؑ نے بھی اپنے کلمات و خطبات اور عمل کے ذریعہ امت مسلمہ کو ان کی ذمہ داریوں کا احساس دلایا کہ اگر دین اسلام اور شریعت محبوبِ خدا میں انحرافات و تحریفات یا خرافات کو داخل ہوتا دیکھیں تو ایسے میں انھیں دین کو اپنی اصلی شکل و صورت میں باقی رکھنے کیلئے کیا کرنا چاہئے۔ لہٰذا ابقائے دین و مکتب کی خاطر قیام و جہاد کی دعوت کا نام عنوانِ عاشورہ ہے۔

لغت عرب میں کلمۂ "عاشورا" ایک منفرد اور غیر قیاسی صیغہ ہے۔ گرچہ یہ

کلمۂ عشرہ کے مبالغہ بیانی کا صیغہ ہے لیکن دس محرم کے لئے مختص ہوا ہے۔ یہ روز وہ ہے جس دن حضرت امام حسینؑ انصار و اعوان اور جوانان بنو ہاشم کے ساتھ شہر کوفہ کے کنارے پر واقع سر زمین کربلا میں شہید کر دیئے گئے شہادت کے بعد لشکر اعدا نے آپؑ کے اہل بیتؑ کو اسیر کر کے کوفہ و شام لے گئے۔ تاریخ بشریت میں ہر وہ واقعہ جو غیر عادی ہو خواہ قوم و ملت کیلئے باعث مسرت ہو یا باعث دکھ و مصیبت وہ قوم ہر سال اس واقعہ کی یاد مناتی ہے۔ البتہ یاد منانے کے طور و طریقہ سے پتا چلتا ہے کہ اس قوم کی علمی اور فکری سطح کس حد تک بلند ہے۔

دس محرم الحرام سنہ ٦١ ہجری کو پیش آنے والا واقعہ عاشورا بھی تاریخ بشریت میں ایک ایسا ہی ناقابل فراموش و غیر عادی واقعہ ہے۔ اس دن وقوع پذیر ہونے والا حادثہ حسینؑ کے عزیز و اقارب اور آپؑ کے ماموم و پیرو کار سب کیلئے مندمل نہ ہونے والا ایک زخم اور فراموش نہ ہونے والی ایک عظیم مصیبت ہے۔ اس مصیبت میں تمام ملت اسلامیہ برابر کی شریک ہے۔ لہذا آئمہ طاہرینؑ سے وارد زیارات کے فقرات میں آیا ہے کہ (آپؑ کی) مصیبت تمام مسلمانوں کیلئے گراں ہے۔ البتہ اس مصیبت کی یاد منانے کے طور و طریقے میں شدید اختلاف پایا جاتا ہے۔ اختلافات میں شدت کی چندین وجوہات ہیں۔ منجملہ دیگر وجوہات کے ایک اہم اور بنیادی وجہ یہ ہے کہ یہ مراسم ادائیگی عوامی سوچ کے حامل افراد کے کنٹرول ہیں۔ یہ لوگ اس دن کی یاد منانے میں نہ علم و عقل کے اصولوں کا خیال رکھتے ہیں، نہ شریعت کے حدود و قیود کا بلکہ اس اہم دن کو بھی اپنے علاقے اور قومیت کے دیگر تہواروں کے مانند اپنی رائج ثقافت کے روشنی میں مناتے ہیں۔ جس کی وجہ سے نہ صرف یہ کہ امت میں اختلافات پیدا ہو گئے بلکہ ایک علاقے کے منانے کا طریقے دوسرے علاقے سے مختلف ہے۔ اس سلسلہ میں مختصراً چند

نمونے پیش کرتے ہیں :

ا۔ کردار بنو اسد :

میدان کربلا سے نزدیک ایک آبادی تھی جنکا تعلق و قبیلۂ بنی اسد سے تھا۔ ساتویں محرم الحرام سے دسویں محرم الحرام کے دوران امام حسینؑ لشکر اعداء کے محاصرے میں گھر چکے تھے۔ اسی دوران امام حسینؑ کے اس چھوٹے سے لشکر کے ایک پرچم دار اور آپکے دوست حبیب ابن مظاہرؓ جو خود بھی قبیلۂ بنو اسد سے تعلق رکھتے تھے، امام حسینؑ سے اجازت لے کر اپنی قوم کے پاس گئے اور انہیں امام حسینؑ کی نصرت کی دعوت دی۔ گرچہ انہوں نے اس دعوت کو قبول کیا لیکن لشکر عمر سعد کی مختصر سی مزاحمت پر یہ قبیلہ اپنی جان بچاتے ہوئے اپنے گھروں میں واپس چلا گیا اور حبیبؓ دست خالی مایوسی کے عالم میں امام حسینؑ کی خدمت میں واپس آئے۔ چنانچہ روز عاشورا لشکر عمر سعد نے دف و ڈھول کے ساتھ آغاز جنگ کیا اور کربلا کی فضاء لشکر حق و باطل کی جنگ سے غبار آلود ہوگئی تو اس قبیلے نے معرکۂ حق و باطل کے اس منظر کا اپنے گھروں کی چھتوں سے یا کسی اور اونچی جگہ سے نظارہ کیا ہوگا۔ امام حسینؑ کی شہادت کے بعد ۱۳ محرم الحرام کو قبیلے کی خواتین کے غیرت دلانے پر اس کے مرد حضرات آلات تدفین لے کر میدان میں آئے اور امام حسینؑ کے علاوہ دیگر شہدائے بنو ہاشم و غیر بنو ہاشم کو اس سرزمین میں دفن کر کے اپنا اسلامی فریضہ انجام دیا اور واپس چلے گئے، اس سے زیادہ اس قبیلے کا کوئی اور کردار سامنے نہیں آیا۔ لیکن امام حسینؑ کے بعض چاہنے والوں کی نظروں میں بنو اسد کا یہ کردار اتنا اعلیٰ وارفع نظر آنے لگا کہ اس کی ایک خصوصی مثال ہر سال عاشورا کے موقع پر پیش کرتے ہیں۔ دنیا کے بعض علاقوں میں بلخصوص ہمارے علاقے (سرزمین پاک و ہند) میں اس صدی کے آخر میں انتہائی

شدت سے اس چیز کو فروغ ملا ہے۔ علاوہ ازیں ہر علاقے بعض بااثر گروہوں نے اپنے امام بارگاہوں میں کثیر رقم خرچ کر کے امام حسینؑ اور انصار امام حسینؑ کی قبور مطہرہ کی ایک بناوٹی شکل (بنام شبیہ روضہ) بنانے کی مہم شروع کی ہے۔ اسکی اصل وجہ یہ ہے کہ عاشورا کی ان بناوٹی یادگاروں کے ذریعہ کثیر آمدنی ہوتی ہے۔ لیکن اس طرح یاد منانے سے مذہب میں خرافات اور فرسودگی کو فروغ مل رہا ہے اور دین اسلام کے احکام کو چیلنج کا سامنا ہے کیونکہ ان ضریحوں کے گرد بے پردہ خواتین اور مرد مخلوط گھومتے ہیں۔ ایک طرف یہ حال ہے دوسری طرف ملت تشیع سے تعلق رکھنے والے دین ومذہب کے پابند اور امت محمدیؐ کے عاشق و شیفتہ و بہت سے افراد فقرو محرومیت کی زندگی گزار رہے ہیں جبکہ ملت کی دولت ایسی تعمیرات اور صندوقوں میں لگ رہی ہے جنکے ذریعہ سے آمدنی ہوتی ہے یہ تو معلوم ہے لیکن اس رقم کا مصرف مجہول ہے۔

اس وقت عاشقان و شیفتہ گان امام حسین علیہ السلام وہی کردار جو قبیلۂ بنی اسد نے انجام دیا تھا اسی کو بطور مفروضہ انجام دینا اپنا فریضۂ مذہبی اور ادائے حق امام سمجھتے ہیں۔ البتہ قبیلۂ بنو اسد اور دور حاضر کے عاشقان و شیفتہ گان میں تین بنیادی فرق پائے جاتے ہیں:

۱۔ قبیلۂ بنی اسد نے امام حسینؑ اور آپؑ کے انصار کے اجساد پاک کو زمین میں دفنایا تھا جبکہ اس وقت کے مومنین ایک فرضی تابوت اپنے دوش پر اٹھاتے ہیں۔

۲۔ قبیلۂ بنو اسد اجساد پاک کو دفنانے کے بعد دست خالی اپنے گھروں میں گئے لیکن آج کے مومنین جب واپس آتے ہیں تو انکے کندھوں پر رکھے ہوئے تابوت رقم اور زیورات سے بھرے ہوتے ہیں۔

۳۔ بنو اسد نے شہداء کی لاشوں کو دفنانے کے علاوہ اس سلسلہ میں کوئی اور

کردار ادا نہیں کیا۔ لیکن آج کل کے مومنین نے اس ذریعے سے حاصل ہونے والی درآمدات کو دیکھ کر فرضی ضریح بنانے کا سلسلہ بھی شروع کیا ہوا ہے۔ ان حرکتوں سے بہت سے منفی آثار نتائج برآمد ہوئے ہیں مگر افسوس حسینی تعلیمات سے آگاہ نہ ہونے کی وجہ سے تحریفات و خرافات کا رواج عام ہوتا چلا گیا جس نے حسینیت کے پرنور چہرہ کو دھندلا کے رکھدیا ہے۔ مگر اسلام اور شریعت محمدیؐ (یعنی حقیقی حسینیت) کے ساتھ روا اس ظلم و ستم پر انہیں کوئی افسوس نہیں ہوتا کیونکہ ہر مجلس، ہر تقریر اور ہر جلوس کے بعد ان کی جیبیں نوٹوں سے بھر جاتی ہیں۔

۲۔ من گھڑت کردار بنام تاسی اویس قرنی :

گزشتہ ایک دو صدی سے اس عوامی ٹولے نے اپنی شجاعت و بہادری اور غم و غصہ کا مظاہرہ یزید ان وقت یہود و نصاریٰ (صلیبی جنگ کا چیلنج کرنے والوں) کے خلاف کرنے کے بجائے ایام عاشورا میں اپنے سر و پشت اور سینے پر زنجیریں اور چھریاں مارنے کا سلسلہ شروع کیا ہوا ہے۔ بد قسمتی سے جس طرح زندگی سے مایوس بعض انسان طبیب سے بغاوت کر کے علاج سے انکار کر دیتے ہیں اسی طرح یہ مومنین پیغمبرؐ خدا اور آئمہ طاہرینؑ کے حکم کے مطابق دین و شریعت بتانے والوں سے یہ کہتے ہوئے بغاوت کر دیتے ہیں کہ ان ایام میں ہم کسی کے پابند نہیں ہیں کیونکہ عاشورا میں امام حسینؑ اور آپکے جوانوں کے جسم تیر و تلوار اور نیزوں سے چور ہو کر خون میں غلطان ہوئے ہیں۔ تو ہم انکی یاد میں کیوں کر اپنے آپ کو نہ ماریں ؟ اس مسئلے میں وہ فقہاء و مجتہدین سے فتویٰ لینے کے بجائے از خود ایک من گھڑت اور خود ساختہ سند کو بنیاد بنا کر اجتہاد کرتے ہیں۔ ان حضرات کا کہنا ہے کہ حضرت اویس قرنی صحابیٔ جلیل قدر پیغمبر اکرمؐ و امیر المومنینؑ (جو کہ جنگ صفین

میں امیر المومنینؑ کے رکاب میں شہید ہوئے) انہوں نے جب یہ خبر سنی کہ جنگ اُحد میں پیغمبر اکرمؐ کے دندان مبارک شہید ہوگئے ہیں تو فرط محبت میں آپ نے اپنے سارے دانت توڑ ڈالے۔ جب صحابیٔ رسولؐ ایسا کر سکتے ہیں تو ہم کیوں کر ان کی تاسی کرتے ہوئے امام حسینؑ کے زخم کو یاد کر کے خود کو زخمی نہ کریں' انکا یہ مفروضہ 'اجتہاد جس کی نہ عقل اجازت دیتی ہے اور نہ شریعت چندین لحاظ سے مخدوش عمل ہے:

۱۔ حضرت اویس قرنی کے پیغمبر اکرمؐ پر ایمان لانے کی تاریخ دقیقاً معلوم نہیں ہے۔ لہٰذا نہیں کہہ سکتے کہ وہ جنگ احد کے موقع پر ایمان لا چکے تھے یا نہیں ۔

۲۔ علماء و فقہاء کا اس پر اتفاق ہے کہ صرف معصومینؑ کے اقوال و افعال حجت ہیں نہ کہ اصحاب کے جبکہ حضرت اویس قرنی تو ممکن ہے تازہ تازہ مسلمان ہوئے ہوں لہٰذا احکام شریعت سے بطور کامل واقف نہ ہونے کی وجہ سے شاید ایسے کسی عمل کے مرتکب ہوئے ہوں۔ اس صورت میں انکا یہ عمل دوسروں کیلئے قابل تاسی نہیں ہو سکتا۔

۳۔ جب پیغمبر اکرمؐ کے دندان مبارک شہید ہوئے تو امیر المومنین علی بن ابی طالبؑ کے علاوہ حضرت سلمانؓ 'ابوذرؓ' عمار یاسرؓ اور حضرت مقدادؓ جیسے جانثار صحابہ اسی میدان میں موجود تھے جبکہ 'مدینے میں آپؐ کی پھوپھی صفیہ اور دختر گرامی جناب زہرا (س) موجود تھیں لیکن انکے بارے میں ایسی کوئی روایت نہیں ملتی۔ کیا ان سب سے زیادہ اویس قرنی پیغمبر اکرمؐ سے عشق رکھتے تھے ؟

۴۔ بالفرض اگر آپ یہ سب اویس قرنی کی تاسی میں کرتے ہیں تو کیوں پیغمبر اکرمؐ کے نام پر اپنے دانتوں کو نہیں توڑتے ہیں!

۵۔ آپ نے خطباء و ذاکرین سے سنا ہوگا کہ شھداء کے اجسادِ پاک خون میں غلطان

کربلا کی ریت پر پڑے تھے اور آپؑ کے اہل بیت اطہارؑ حضرت زینبؑ وام کلثومؑ، فاطمہ صغراؑ، سکینہؑ ورباب کو جب اس قتل گاہ سے گزارا گیا تو کیا انہوں نے اپنے عزیزوں کی لاشوں کو نہیں دیکھا تھا، کیا سید سجادؑ نے نہیں دیکھا تھا۔ لیکن کیا ان میں سے کسی نے بھی یہ منظر دیکھ کر اپنے آپ کو اس طرح مارا ہے؟

۶۔ کیا شہادت امام حسینؑ کے بعد آنے والے آئمہ اطہارؑ میں سے کسی نے اس سلسلے میں کوئی حکم یا ہدایت دیا؟ اگر یہ ایک فعل مستحسن ہوتا تو ان میں سے کوئی تو اس کو بجالاتا اور آئمہؑ اسکی تائید فرماتے۔

دوسری دلیل یہ گروہ بعض مجتہدین کے اس جواب کو قرار دیتے ہیں کہ جب ان مراجع سے پوچھا گیا کہ کیا زنجیر و قمہ زنی مصیبت امام حسینؑ میں مارنا صحیح ہے تو انہوں نے اس کے جواب میں یوں فرمایا: ''ہم مادر حسینؑ سے ڈرتے ہیں'' یہ دلیل بھی چند لحاظ سے ایک مخدوش اور مکڑی کے جال کی طرح بوسیدہ ہے۔

۱۔ کسی مجتہد نے یہ نہیں فرمایا ہے کہ مجتہد کی خاموشی بھی ایک حجت ہے اور اس پر عمل کرنا ضروری ہے۔

۲۔ ان (مجتہدین) کو مادر حسینؑ سے زیادہ امام زمان (اپنے وقت کے امامؑ) سے ڈرنا چاہئے کیونکہ وہ امام زمانؑ حاضر وناظر ہیں اور مجتہد ان کا نمائندہ ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اس سلسلہ میں اگر کوئی مادر حسینؑ کا نام لیتا بھی ہے تو صرف عوامی جذبات سے کھیلنے اور ان کو ٹھنڈا کرنے کیلئے لیتا ہے کیونکہ وہ مادر حسینؑ سے نہیں بلکہ اس قسم کے سوال کرنے والے کے سوال سے ڈرتے ہیں۔

کتب تاریخ میں امام حسینؑ کے خطبات و کلمات الحمد اللہ اب بھی محفوظ ہیں جن ان میں امام حسینؑ کا یہ پیغام اور وصیت موجود ہے کہ ''میں شریعت محمدؐ کی معروف بنیادوں کو اٹھانے اور منکرات کو گرانے کیلئے قیام کر رہا ہوں''۔ یعنی امام

حسینؑ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کیلئے گھر سے نکلے تھے۔ آپ کا مقصد امت مسلمہ کو انحرافات و خرافات سے روکنا' ان کی اصلاح کرنا اور شریعت محمدیؐ کو پس پشت ڈالنے سے باز رکھنا تھا۔

امام حسینؑ کے پیغام اور وصیت سے اکثر علماء وذاکرین یا تو آگاہ نہیں ہیں اور جو آگاہ ہیں بھی ان کی اکثریت اس پیغام کو منبر رسولؐ سے پیش کرنے میں دانستہ طور پر کوتاہی کی مرتکب ہوتی ہے۔ یہ لوگ تھوڑے سے دنیاوی فائدہ کی خاطر تمام معصومینؑ کے کلمات و خطبات بالخصوص نہج البلاغہ سے کلام امیر المومنینؑ' قرآن سے احکاماتِ خدا اور سولؐ اور امام حسینؑ کے پیغام اور وصیت اور دیگر حقائق پر پردہ ڈالنے کے جرم میں مبتلا ہیں۔ ان حضرات کی کوتاہیوں اور اغماض کی وجہ سے ہم بھی علم و معرفت کے گراں قدر سرمائے اور بہت سے قیمتی اور سبق آموز حقائق سے آشنا ہونے سے محروم رہ گئے۔

امام حسینؑ فرماتے ہیں :

"جو میری بات اور میرے کلمات واحکامات کو دل سے قبول کرے اور پھر ان پر عمل بھی کرے' دراصل اس نے میری نہیں بلکہ حق کی بات قبول کی اور جس نے مجھے مسترد کر دیا اور میرے کلمات واحکامات پر عمل نہ کیا' دراصل اس نے حق کو مسترد کر دیا"۔

گویا امام حسینؑ یہ کہنا چاہتے ہیں :

"یاد رکھو! ہم اپنی طرف سے کوئی بات نہیں کہتے۔ لہذا جو ہمارے احکامات پر عمل کرنے کی بجائے انہیں نظر انداز کرے اور محبت و مودت یا عقیدت و احترام کے نام پر اپنے یا اپنے من پسند لوگوں کے بنائے ہوئے راستے پر چلا' اس نے ہمارے احکامات کے مقابلے میں دوسروں کے احکامات کو فوقیت دی۔

اور اس طرح ہمارے احکامات کی فضیلت کے باوجود اپنے جیسے دنیا پرست لوگوں کے احکامات پر عمل کر کے انہیں ہم پر مقدم جاننے کا ثبوت فراہم کیا۔ اس نے دراصل اپنے عمل سے ہماری مخالفت کی جو کہ اصل میں خداوند متعال کی مخالفت ہے کیونکہ ہم خدا کے نمائندے ہیں اور حجتِ خدا ہونے کے ناطے ہماری اطاعت و پیروی واجب ہے"۔

ثابت ہوا کہ امام حسینؑ کے پیغام اور احکامات پر عمل نہ کرنے والے انؑ کی محبت میں جتنے بھی اور جیسے بھی اعمال کریں، انہیں امامؑ کی رضا و خوشنودی حاصل نہیں ہو سکتی۔

امام حسینؑ نے فرمایا:

"مسلمانوں پر اس وقت جو حاکم مسلط ہے وہ کسی بھی حوالے سے اسلام و مسلمین پر حکمرانی کرنے کا اہل و حق دار نہیں ہے۔ میں شریعت محمدیؐ سے انحراف کرنے والی اس حکمرانی کی اصلاح چاہتا ہوں۔ تمہیں بھی اس سلسلے میں میری تأسی کرنی چاہئے۔

لوگ حق پر عمل پیرا نہیں ہیں اور باطل کی پیروی سے باز نہیں آرہے ہیں۔ ایسی صورت میں حق کی سربلندی کیلئے اور باطل کی سرکوبی اور نابودی کیلئے حق کو دبانے والوں اور باطل کو اٹھانے والوں کے ساتھ نبرد آزما ہونا چاہئے اور اس راہ میں مرنے سے خوف زدہ نہیں ہونا چاہئے"۔

یہ تھی امام حسینؑ کی وہ وصیت جس پر عمل کے ذریعے ہم تمام معصومینؑ کی رضا و خوشنودی حاصل کر کے رضائے خدا تک پہنچ سکتے ہیں اور اپنی عاقبت سنوار سکتے ہیں۔ مگر افسوس کہ اس وصیت کو مسلمانانِ عالم بالخصوص اہل تشیع تک پہنچانے اور انہیں اس پر عمل کی طرف راغب کرنے میں سب سے بڑی رکاوٹ

یا تو خود ہمارے علماء وذاکرین حضرات ہیں یا محبان اہل بیت ؑ ہونے کا دعویٰ کرنے والے وہ عوام ہیں جو اپنے علماء وذاکرین کے توسط سے وصیت امام حسینؑ پر پردہ ڈالنے کی کوششیں کرتے ہیں۔

ہر دور اور ہر زمانے میں، جس وقت اور جس جگہ بھی دوستداران امامؑ ہوں، عاشقان حسینؑ ہوں یا سیرت امام حسینؑ کے پیرو و تابع ہونے کے دعویدار ہوں، انہیں چاہئے کہ زبان کلامی دعوے نہ کریں بلکہ اپنی ہر چیز کو اسلام کی سربلندی کیلئے داؤں پر لگا دیں، یہ واجب نہیں ہے کہ سو پچاس یا چند ہزار لوگوں کی کسی تنظیم گروہ، ادارے، دستے یا مسجد وامام بارگاہ یا اپنے علاقے سے یا خاندان کی سرپرستی میں نکالے جانے والے جلوس وغیرہ کی سربلندی پر اپنی تمام تر توجہ مرکوز رکھیں اور جسمانی، مادی، فکری اور عملی ہر طرح کی تمام قوتیں انہی چیزوں پر لگا دیں بلکہ اصل میں جو چیز واجب ہے وہ یہ ہے کہ پیغام اور وصیت امامؑ کو سمجھیں اور اسے عام کریں، اس پر عمل کے موثر طریقے تلاش کریں جو کہ معصومینؑ کی سیرت میں پنہاں ہیں۔ امامؑ کی وصیت پر عمل کرتے ہوئے صرف اور صرف اسلام اور حسینیت جو کہ ایک ہی چیز کے دو نام ہیں کی سربلندی کیلئے قدم اٹھایا جائے۔

ہمارے ان مفروضات کو سمجھنے کیلئے عنوانِ عاشورہ کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔ دراصل یہ عنوان عاشورہ سے ناآشنائی ہی کی وجہ ہے کہ عاشورہ کے حوالے سے ہم نے جن طریقوں کو اپنایا ہے اور جن رسوم و رواج کو رائج کیا ہے وہ سب اسلام سے دور کرنے والی ہیں۔ قرآن اور سیرت معصومینؑ سے ملنے والی تعلیمات جو باعث نجات ہو سکتی ہیں کے مقابلے میں مفاد پرست لوگوں کے ایجاد کردہ افکار و نظریات اور رسوم و رواج کو حقیقی دین کے طور پر متعارف کروانے، امت مسلمہ میں انتشار پھیلانے، جامد چیزوں کو رواج دینے اور ان کے عشق و محبت میں امت

کو مصروف رکھنے ' لاحاصل بحثوں میں وقت اور توانائیاں ضائع کرنے اور لوگوں کو مال و دولت اور دنیا بنانے کے طریقے سکھانے کا عنوان بنا ہوا ہے۔ مگر یہ عنوان عاشورہ نہیں ہے۔

عنوان عاشورہ تو خود کو قربان کر کے اسلام کو زندہ کرنے کا نام ہے مگر جو رسومات ہمارے پاس ہیں اور جن کو جاری و ساری رکھنے کیلئے ہم بڑی تگ و دو کرتے ہیں تو وہ اسلام اور فکر امام حسینؑ کو ذبح کر کے اور تعلیمات اسلام کو دبا کر یعنی احکامات محمدؐ و آل محمدؐ کو عوام کی نظروں سے اوجھل بنا کر خود کو زندہ اور نمایاں رکھنے کا مظاہرہ نہیں۔

زیر نظر کتاب میں ہم نے عنوان عاشورا کے بارے میں چند مقالے جمع کئے ہیں جس میں اس حقیر کا بھی ایک مقالہ شامل ہے جس میں اس نکتے کی طرف توجہ مبذول کرانے کی دعوت دی ہے کہ ایام عزا میں عنوانِ عاشورہ کا خیال رکھا جائے۔ ایسے عنوانات جو دانستہ یا نادانستہ طور پر اس میں داخل کر دیئے گئے ہیں جو اصل عنوان سے اجنبی بنانے اور دور کرنے کا باعث بن رہے ہیں ان سے ہوشیار رہا جائے اور دین و مکتب اور مومنین کو ان کے نقصانات سے محفوظ رکھنے کی سعی و کوشش کی جائے۔

دوسرا مقالہ شہید باقر الصدرؒ کا ہے جس میں شہید سید باقر الصدرؒ نے بتایا ہے کہ امتوں کی موت دو قسم کی ہوتی ہے ان میں سے ایک کا نام موت جہالت ہے۔ اسکی مثال دیتے ہوئے آپ فرماتے ہیں کہ امام حسنؑ کے دس سالہ دورِ امامت میں امت محمدؐ اپنے فرائض سے ناآگاہی اور نادانی کی زندگی گزار رہی تھی یعنی ان پر موتِ جہالت طاری تھی۔

شہید باقر الصدرؒ فرماتے ہیں کہ دوسری موت موتِ ارادہ ہے۔ جب امام

حسینؑ نے قیام فرمایا اس وقت یہی کیفیت طاری تھی کیونکہ اس دور میں امت کے ارادے مردہ ہو چکے تھے۔

تیسرا مقالہ "میدان جنگ میں امام حسینؑ کے خطبات" کے نام سے ہے۔ اس مقالہ میں امام عالی مقامؑ کے روز عاشور دیئے گئے تین خطبات کو اردو ترجمہ کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔

چوتھا مقالہ جناب آیت اللہ مفتی سید آغا جزائری کا ہے۔ اس میں آپ نے حکومت اسلامی کے خدوخال کو بیان فرمایا ہے اور یہ بتایا ہے کہ آپؑ کس قسم کی حکومت اسلامی کے خواہاں تھے۔ اس سلسلہ میں آپ نے امام حسینؑ کے چند کلمات اور خطبات کو بھی پیش کیا ہے جس میں آپؑ نے حکومت اسلامی کے قیام کی ضرورت اور اس کے حدود و قیود کو بیان فرمایا ہے۔

پانچواں مقالہ جناب سید حسنین رضوی کراروی صاحب کا ہے۔ اس مقالہ میں آپ نے اس چیز کی وضاحت کی ہے کہ بنوامیہ نے حکومت پر قابض ہونے کیلئے کیا کیا اقدام کئے اور وہ اسلام کے چہرے کو کیسے مسخ کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ ان حالات کے پیش نظر امام حسینؑ کیلئے قیام کرنا ناگزیر ہو گیا تھا۔ ان حقائق کو سامنے رکھتے ہوئے امامؑ کا یہ قیام ایک آگاہانہ اقدام تھا۔

چھٹا مقالہ آیت اللہ شہید ڈاکٹر بہشتیؒ کا ہے۔ اس مقالہ میں آپ یوں لکھتے ہیں کہ سب سے پہلے ایک انسان اپنے آپ سے مبارزہ کرتا ہے۔ پھر یہ انسان اپنے سے باہر بہت سی رکاوٹوں کو دیکھ کر ان سے جہاد شروع کرتا ہے۔ انفرادی حد سے بھی گزر کر معاشرہ کی معاشرہ سے، طبقہ کی طبقہ سے قوم کی قوم سے اور ملت کی ملت سے جنگ ہوتی ہے۔ لہٰذا یہ جنگ و جدال اور جہاد ہمیشہ اور کسی بھی حالت میں انسان کے ساتھ ہوتے رہتے ہیں۔ اس جنگ میں کامیاب ہونے کی

کچھ شرائط ہیں جن کا ذکر اس مقالہ میں کیا گیا ہے۔ امام حسینؑ کے اس مقدس جہاد میں یہ تینوں شرائط مکمل طور پر موجود تھیں۔

ساتواں مقالہ آج کے دور میں تاریخ کے نامور اور مشہور محقق جناب حجۃ الاسلام رسول جعفریان کا ہے۔ واقعۂ کربلا کے بارے میں یہ ایک تحقیقی مقالہ ہے۔

ان چند مقالات کے مجموعہ پر مشتمل کتاب کا نام ہم نے ''عنوانِ عاشورہ'' رکھا ہے۔ حسبِ سابق قارئین کرام اور عاشقان و شیفتگانِ امام حسینؑ سے اب بھی یہی گزارش ہے کہ امام حسینؑ سے متعلقہ علوم و مسائل کو بحث و گفتگو اور علم و تحقیق کے میدان میں لائیں اور اہل باطل کے نظریات کی رد میں جذباتی اور ہوائی گفتگو کرنے کی بجائے استدلال سے کام لیتے ہوئے انہیں بھی حقیقی اسلام اور حسینؑ شناسی کی دعوت دیں جہانتک ہمارا تعلق ہے ہم ایک بار پھر یہی درخواست کرینگے کہ ہمیں ہماری غلطیوں اور کوتاہیوں کی نشاندہی کے ساتھ بہتر خدمت کی تجاویز سے نوازیں۔ ربِ غفور و رحیم، پیغمبر گرامی قدرؐ اور ان کے دلبر حسینؑ عزیز اور وقتِ حاضر کی حجتِ خدا امام عصر الزمان (عج) کی بارگاہ میں اپنی کوتاہیوں کیلئے معذرت خواہ ہیں۔

علی شرف الدین موسوی

عیدالفطر ۱۴۲۲ھ

عنوان عاشورا

مقالہ نگار : علی شرف الدین موسوی

عنوان بروزنِ صنوان' آشناء و معروف کلمہ ہے۔ یہ مادۂ عنی 'یعنی' سے ماخوذ ہے جو ارادہ' طلب اور مقصود کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ علماء اور دانشمندوں کی اصطلاح میں یہ کلمہ تمہید' مقدمۂ علوم' مفتاح العلوم وغیرہ کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ علم منطق میں عنوان موضوع کو کہتے ہیں اور اس کے ذیل میں جو کچھ ہوتا ہے اسے محمول کہتے ہیں یعنی آئندہ ہونے والی تمام گفتگو اس عنوان کے تحت ہوگی۔

مصنفیّن ومؤلفین اپنی کتاب کے نفس مضمون کو مقدمہ یا تمہید میں تحریر فرماتے ہیں'اس لئے اسے عنوان کہتے ہیں۔ اور اساتذۂ فنِ خطابت و تقریر کا کہنا ہے کہ اپنی گفتگو کا ماحصل پہلے اپنے مقدمۂ کلام میں بیان کرنا چاہئے خواہ وہ تحریر ہو یا تقریر تاکہ قارئین وسامعین بصیرت و آگاہی اور آمادگی سے کتاب کو پڑھیں اور تقریر کی سماعت کریں۔ زیرِ نظر کتاب کا نام ہم نے "عنوان عاشورا" رکھا ہے۔ ہماری محدود اطلاع کے مطابق ابھی تک امام حسینؑ سے متعلق اس نام سے کوئی کتاب موجود نہیں ہے۔ ہم اس مناسبت سے کہ عزاداری و مجالس امام حسینؑ

جو کہ دنیا بھر کے شیعہ ' دوست داران اہل بیتؑ سال بھر میں بالخصوص ہمارے ملک پاکستان میں دو مہینہ مسلسل دن رات منعقد کرتے ہیں 'ان مجالس کے انعقاد کیلئے بنائی گئی جگہ ' چندے 'خطیب و مقرر اور سامعین سب کے نزدیک پہلا عنوان امام حسینؑ اور عاشورائے حسینؑ ہے۔ یہ ایک جامع و کامل عنوان ہے۔ یہ ایک بنیادی اور اصلی عنوان ہے اور بہت سے اجزاء رکھتا ہے۔ پھر ان میں سے ہر ایک اپنے اندر اور بھی عناوین رکھتے ہیں۔ لہٰذا محرر و مقرر اور دیگر اہتمام کنندگان سب کو چاہئے کہ عنوان جتنا بھی ہو سکے حسینؑ و عاشورا سے نزدیک ہو' دور نہ ہونے پائے۔ جتنا فاصلے میں اضافہ ہوتا جائے گا' گرچہ ہم اس میں ارتباط کو ثابت کریں گے 'لیکن سامع و قاری سے اس کا تصور اتنا ہی دور ہوتا جائے گا۔ عاشورائے امام حسینؑ پر اس وقت ایسی ہی صورت حال پیش آئی ہے۔

اس کے بعد ہم قارئین کرام کو ان مسائل کی طرف متوجہ کریں گے کیونکہ فیصلہ کرنے والے اور اہل حل و عقد دراصل قارئین و سامعین ہی ہیں۔ چنانچہ جس طرح وہ اپنی متعلقہ اشیاء کی نگرانی کرتے ہیں اور اپنی گفتگو کا خیال رکھتے ہیں' اسی طرح اس بات پر بھی نگراں ہیں کہ بولنے والے اصل موضوع سے طفرہ نہ اگائیں تاکہ گفتگو اپنے موضوع سے اجنبیت اختیار نہ کرے۔ اگر خدانخواستہ ایسا ہوا تو اس سے دشمنان امام حسینؑ اور مخالفین اسلام کو فائدہ پہنچے گا اور حسینؑ و حسینیوں کو نقصان و خسارہ اٹھانا پڑیگا۔ بد قسمتی سے دور حاضر میں ہمارے ساتھ یہی کچھ ہو رہا ہے۔ ہماری تمام مشکلات اور مصیبتوں کا حل اس میں ہے کہ ہم' عنوان و کلام گفتگو جہاں بھی پہنچے وہاں سے بالکل پیچھے عاشورا پر آئیں اور اس کے بنیادی اجزاء وارکان کے بارے میں بسط زبان و قلم کریں تاکہ اہل دنیا' انصاف پسند حق طلب اور سب لوگ یہ سمجھ سکیں کہ ہم کس کے بارے میں بات کرتے ہیں

اور کیا کہنا چاہتے ہیں؟

آیئے پہلے ہم عنوان عاشورا کے اصلی اور بنیادی اجزاء کے بارے مین گفتگو کرتے ہیں۔ ان اجزاء کے بارے میں بقدر امکان وضرورت وضاحت کرنے کے بعد انکے اندر موجود دیگر ذیلی عنوانات کی طرف اشارہ کریں گے 'پھر فی زمانہ رائج عنوانات کی طرف آپ کو متوجہ کریں گے تاکہ آپ بھی اس سلسلے میں اپنے وجدان اور ضمیر کو سامنے رکھتے ہوئے انکے مطابق اپنا نقطۂ نظر بیان کر سکیں۔

عنوان عاشورا

کرۂ ارضی اور ملل وادیان تاریخ کی واقعات وحادثات سے پُر ہے۔ اہل ادیان کیلیئے سب سے اہم واقعات انبیاء اور انکے مقابل طاغوتوں سے مبارزہ کے عناوین ہیں۔ طوفان نوحؑ کرۂ ارض کا ایک عنوان ہے۔ اسی طرح ابراہیمؑ و نمرود اور موسیٰؑ و فرعون کا مقابلہ اور ظہور غلبۂ اسلام وغیرہ سب تاریخ ارضی کا ایک ایک عنوان ہیں۔ جہاں ایک موضوع اسلام ہے وہاں فریق خاتم النبیین حضرت محمد مصطفیٰؐ اور صنادید مشرکین ابو جہل اور سر ابر آوردہ خاندان بنو امیہ ابو سفیان اور ان سے وابستگان ہیں۔ اسی تاریخ کے تسلسل میں ایک ایسا انوکھا اور محیّر العقول واقعہ گزرا ہے جس نے ماضی کے عناوین کو پس پشت ڈال دیا اور آنے والے واقعات و حوادثات کے عناوین کو بے رنگ بنادیا ہے۔ یہ عظیم الشان واقعہ 'واقعۂ عاشورا ہے۔ اس واقعہ کی اپنی ایک روئداد ہے جسے علمائے تاریخ' تاریخ نقلی کہتے ہیں اور اس واقعہ کے اسباب ومحرّکات کو تاریخ علمی کہا جاتا ہے۔ اسی طرح اس کے حتمی آثار ونتائج ہیں جسے فلسفۂ تاریخ کہتے ہیں۔ گرچہ دین ومذہب سے متعلق انتہائی اہمیت کے حامل کثیر الاستفادہ موضوعات کتنے ہی کیوں نہ ہوں امام حسینؑ سے متعلق منعقدہ مجالس میں عاشورا ہی کو عنوان بنانا چاہئے۔ ورنہ دیگر عنوانات پر

گفتگو کرنے والا تو غاصب ہوگا اور سننے والے گویا اس غصب پر راضی ہونے والے شمار ہونگے۔ ان مجالس میں عنوان عاشورا کی وضاحت اور تفسیر کے بغیر کسی بھی موضوع پر گفتگو ظلم اور ناانصافی سمجھا جائے گا اور کسی بھی انسان کیلئے قابل قبول نہیں ہوگا۔ پس معلوم ہوا کہ مذکورہ اہداف ومقاصد کو مدّ نظر رکھتے ہوئے جن مجالس کا اہتمام کیا جاتا ہے ان میں کسی اور موضوع پر گفتگو نہیں ہونی چاہیے' اس سلسلے میں مزید بحث کی ضرورت نہیں کیونکہ مجالس امام حسینؑ کا سب سے پہلا عنوان' عاشورا ہے۔

عاشورائے امام حسینؑ پر جب بھی نظر کی جائے اور توجہ کو اس طرف مبذول کیا جائے تو اس واقعے میں تین فریق بطور نمایاں حروف جلی سے لکھے ہوئے نظر آئیں گے :

☆۔ پہلا چہرہ وہ مبارک ومنوّر چہرہ ہے جس میں نبی ختمی المرتبؐ کی صورت' زہرا مرضیہؑ کی مظلومیت' علیؑ کی جلالت اور دین اسلام کی حفاظت کی ضمانت نظر آئے گی۔ یہ چہرہ اس شخصیت کا ہے جو اس واقعے کے منظومۂ شمسی میں مرکزیت کا حاصل ہے۔ اسکے گرد بہت سے ماہتاب وستارے اور پروانے منڈلاتے نظر آئیں گے۔ اس چہرے کی تفسیر وتوضیح کے بعد اسکے گرد چکر لگانے والے ان ماہتابوں' ستاروں اور پروانوں کا ذکر بھی لازمی ہے کیونکہ وہ بھی اس واقعے کا ایک حصہ ہیں۔ یہ چہرہ کسی اور کا نہیں بلکہ خود ذات گرامی حسینؑ ابن علیؑ ہیں۔ اگر آپؑ سرزمین مدینہ سے' محافظت روضۂ رسولؐ کو بنیاد بنا کر جنبش نہ فرماتے یعنی قعود پر قیام کو ترجیح نہ دیتے تو نہ ہی یہ واقعہ پیش آتا تھا اور نہ اسلام کا نام ونشان رہتا۔ جن کی آنکھوں میں اصول ومبانئ اسلامی خار گزر رہے تھے وہ چین وسکون کی زندگی بسر کرتے۔ یہ صحیح ہے کہ

اسلام آج بھی مظلوم ہے لیکن اگر آپ قیام نہ فرماتے تو شاید دنیا کی شکل و صورت کچھ اور ہی ہوتی۔

مدینہ سے خروج اور سرزمین کربلامیں شہادت تک کے دورانیہ میں سینکڑوں حکمت آمیز اقدامات فرمائے ہیں۔اس عرصہ میں مختلف مواقع پر آپؑ نے انتہائی پردرد اور گوہر آبدار کی مانند صاف وشفاف کلمات وخطب صادر فرمائے ہیں جن میں آپؑ کی دس سالہ خاموشی اور پر سکون اور محزون و مغموم زندگی کی تفسیر بھی ملتی ہے اور محیّر العقول ٔ شگفتہ اور بے قرار حرکت کی تفسیر بھی موجود ہے۔ آپؑ کے حکمت آمیز اقدامات اور گوہر و درد سے لبریز کلمات وخطبات کی تفسیر بیان کرنے کیلئے سینکڑوں تو کیا ہزاروں مجالس بھی کافی نہ ہونگی۔ان میں عقائد اسلام کی تفسیر بھی ہے اور احکام اسلام کی تشریح بھی ٔ خدا سے وابستگی اور دنیا سے روگردانی بھی اور مدرسۂ عرفان کا نصاب بھی۔ غرض دنیاو آخرت کی کون سی سعادت ہے جسکاذکران میں نہ ملتاہو۔

حسینؑ ابن علیؑ نے اپنے بڑے بھائی امام حسن مجتبیٰؑ کے دس سالہ دور امامت و قیادت اور قیادتِ امت سے معزولی کی صورت میں اور پھر خود اپنی امامت کے دس سالہ دور میں طرح طرح کے مصائب کا سامنا کیا۔ معاویہ کے مکرو فریب اور اسلامی اقدار کو مسخ کرنے ٔ سفاک اور مجرم افراد کو امت اسلامی کی اقدار پر مسلط کرنے بالخصوص شیعیانِ علیؑ اور دوست داران اہل بیتؑ پر ظلم کے پہاڑ ڈھائے جانے کے تلخ اور ناگوار حالات اسی دور میں پیش آئے۔اس طرح آپؑ کی زندگی انتہائی غم وافسوس اور کرب کے عالم میں گزر رہی تھی کہ اتنے میں معاویہ کی موت کی خبر آئی۔اسی کے ساتھ آپؑ سے بیعت یزید کا مطالبہ کیا گیا جسے آپ کبھی قبول نہیں کر سکتے تھے۔ لہٰذا آپؑ نے مدینہ

چھوڑنے کا فیصلہ کرلیا۔ چنانچہ ۲۸ رجب المرجب سنہ ۶۰ ہجری کو آپؑ اپنے اہل بیتؑ کے ہمراہ مدینہ سے روانہ ہوئے اور ۳ / شعبان کو مکہ میں وارد ہوئے۔ لیکن جلد ہی مکہ کی زمین بھی آپؑ کیلئے تنگ کردی گئی۔ ادھر اہل کوفہ کی جانب سے مسلسل خطوط آرہے تھے کہ آپؑ کوفہ تشریف لائیں۔ انکے جواب میں آپؑ نے اپنے برادر عم جناب مسلمؓ کو کوفہ بھیجا کہ وہاں کے حالات کا جائزہ لیکر بتائیں کیا صورت حال ہے۔ انہوں نے بھی امامؑ کو لکھا کہ حالات موزوں ہیں آپؑ جلد تشریف لائیں۔ لہٰذا ۸ / ذی الحجۃ الحرام کو مکہ چھوڑ کر آپؑ کوفہ کیلئے روانہ ہوگئے۔ لیکن اس سے پہلے کہ آپؑ کوفہ پہنچتے وہاں حالات بدل گئے۔ شہر کی ناکہ بندی کردی گئی اور آپؑ کو کوفہ جانے نہ دیا گیا۔ بلکہ آپؑ کا رخ کربلا کی طرف موڑ دیا گیا جہاں اصحاب اور نوجوانان بنوہاشم کے ساتھ آپؑ بھی شہید ہوگئے۔ آپؑ کے اس قیام میں ایسے چندین موضوعات ہیں جنھیں خطباء و مقررین کو اپنا عنوان کلام بنانے کی ضرورت ہے۔ مثلاً یہ کہ آپؑ کو مدینہ چھوڑنے کی ضرورت کیوں پیش آئی، کیا محرکات واسباب تھے؟ اس سلسلے میں درج ذیل مفروضات قابل غور ہیں:

۱۔ آپؑ پہلے سے ہی ایسے مناسب لمحات اور وقت کے منتظر تھے جو معاویہ کی موت کے فوراً بعد شروع ہونے والے تھے۔ موت کی خبر سنتے ہی آپؑ نے قیام کیا۔

۲۔ یزید کی طرف سے مدینہ میں منصوب حاکم کی جانب سے طلب بیعت پر اصرار اور انکار کی صورت میں لاحق خطرات نے آپؑ کو مدینہ چھوڑنے پر مجبور کیا۔

۳۔ اہل کوفہ کی جانب سے مکرر اور پرزور یا احتجاجی انداز میں لکھے گئے خطوط اور اتمام حجت پر مشتمل پیغامات آپؑ کے قیام کا سبب بنے۔

۴۔ آپؑ کے اور خدا کے درمیان عالم غیب میں اور ماورائے طبیعت ایک عہد و

پیمان موجود تھا جس کے تحت آپؑ نے یہ قیام کیا۔

۵۔ امت کے سینکڑوں سمجھدار اہل حل و عقد' علماء اور دانشمندوں نے آپؑ کو یزید ابن معاویہ کی حکومت سے عدم تصادم کا رویّہ اپنانے کا مشورہ دیا' لیکن آپؑ نے ان تمام مشوروں کو نظر انداز کر دیا۔ گویا اس طرح اسلامی ثقافت اور قرآن و سنت میں تائید شدہ ایک مسلّم موضوع یعنی مشاورت اور اس پر عمل کے حکم کو مسترد کرتے ہوئے قیام کیا اس قیام کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

۶۔ اگر حاکم طاقت ور و قدرت مند ہو تو ایسی صورت میں انسان دین و شریعت کے تحفظ کیلئے صرف اس حد تک جا سکتا ہے جہاں تک اس کے جان و مال کو خطرہ لاحق نہ ہو' جیسا کہ کتبِ فقہ میں امر بالمعروف و نہی از منکر کی شرائط کے ذیل میں درج ہے۔ لیکن آپؑ نے ان شرائط کو نظر انداز کرتے ہوئے قیام کیا۔ اس کی توجیہ کرتے ہوئے امت اسلامی کا ایک گروہ شدت سے اس نظریہ کا حامی ہے کہ حکمران وقت خواہ کتنا ہی فاسق و فاجر کیوں نہ ہو' اس کے خلاف قیام اور اس کی مزاحمت شریعت کے مسلّمہ اصولوں کے خلاف ہے۔ ایسے گروہوں کے اشکالات کے پیش نظر قیامِ حسینؑ کے حامیوں کا جواب وغیرہ عنوان عاشورا کے موضوعات ہونے چاہئیں۔

☆۔ عنوان عاشورا کا دوسرا چہرہ یزید ابن معاویہ ہے۔ امام حسینؑ کا یزید ابن معاویہ کی خلافت اور حکومت کے خلاف قیام کی کیا تفسیر و توجیہ ہے؟ اس سلسلہ میں مندرجہ ذیل مفروضات قائم ہو سکتے ہیں:

۱۔ یزید ابن معاویہ جیسا شخص اپنے غیر اسلامی افعال و اعمال کی بنا پر خلافت اسلامی کے اعلیٰ منصب پر فائز ہونے کا اہل نہ تھا۔

۲۔ یزید ابن معاویہ نے آپؑ سے طلب بیعت کی اور انکار کی صورت میں قتل کرنے کا

حکم نامہ جاری کیا اسلیئے آپؑ کو قیام کرنا پڑا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو آپؑ قیام نہ کرتے۔

۳۔ یزید معاویہ کا بیٹا تھا اور امام حسینؑ خود معاویہ کے خلاف قیام کرنا ضروری سمجھتے تھے۔ لیکن اس کے مکر و فریب اور ریاستی طاقت و قدرت کے پیش نظر معاویہ کی زندگی میں قیام کرنے سے گریز کرتے رہے۔ اسکے برعکس یزید کی حکومت نوخیز اور کمزور تھی۔ اس لئے اس کے خلاف قیام کیا' ورنہ معاویہ کے خلاف بھی آپؑ کو قیام کرنا ہی تھا۔

۴۔ گرچہ معاویہ خلافت اسلامی کے منصب کا اہل نہ تھا' اسلام اور مسلمانوں کے خلاف بہت ناروا سلوک اور کاروائیاں کرتا تھا لیکن اس کے باوجود معاویہ کے ساتھ امام حسن مجتبیٰؑ کا معاہدہ آپؑ کو گویا باندھے ہوئے تھا۔

۵۔ قیام مسئلہ نہیں ہے بلکہ قیام کے آثار و نتائج مثبت ہونے کی توقع ضروری ہے۔ معاویہ کے دور میں ایسے نتائج بر آمد ہونے کی امید نہ تھی کیونکہ اپنے مکر و فریب کے ذریعہ آپؑ کے ہر قیام کو وہ امت میں غیر مؤثر بنانے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ اس چیز نے آپؑ کو قیام کرنے سے روکے رکھا۔

۶۔ یزید ابن معاویہ ایک غیر شرعی خلافت کا وارث تو تھا ہی لیکن جس طرح اس کو خلافت پر فائز کیا گیا وہ بھی ایک انوکھا اور نیا فارمولا تھا جو نہ صرف امت کے برجستہ اہل حل و عقد بلکہ سبھوں کیلئے ناقابل تحمل اور شرعی طور پر ناقابل قبول تھا۔ لیکن ریاستی طاقت و توانائی سے مرعوب، و خوف زدہ ہو کر لوگوں نے سکوت و خاموشی کو اپنے لئے شرعی جواز قرار دے لیا۔ مگر حسینؑ ابن علیؑ نے اسکی چالوں کے بالمقابل تاریخ اسلامی میں یہ فارمولا ایجاد کیا کہ بغیر کسی احتجاج اور انکار کے' ثبت و ضبط ہونے کو چیلنج کرتے ہوئے ہر قسم کی قربانی دینے کیلئے آمادہ ہو کر اسکے خلاف قیام کیا۔

یزید ابن معاویہ کے غیر اسلامی اعمال و کردار، موروثی، غیر شرعی و غیر قانونی خلافت اور انتخاب خلافت کیلئے اپنائے گئے اس انوکھے انداز کے خلاف اعلان نارضائیت کرتے ہوئے آپؑ میدان میں گئے۔ ان تمام اقدامات کے بعد اگر مصالحت کی کوئی شکل بن جاتی تو کیا یہ امام حسینؑ اسے قبول کر لیتے۔ ہر گز نہیں کیونکہ امام حسینؑ کو تو ایسی حکومت کے پرچم کے سائے میں زندگی گزارنا بھی ناگوار تھا۔ چنانچہ ان حالات میں آپؑ کیلئے شہادت ہی واحد راستہ تھا۔

۷۔ شخص یزید کے حوالے سے نہیں، معاویہ کا بیٹا ہونے کے حوالے سے نہیں، بنو امیہ ہونے کے حوالے سے نہیں بلکہ حسینؑ اس حوالے سے خلاف تھے کہ اس کا حکومت پر قابض ہونا، اس کی حرکات و سکنات اور اسکے اقدامات سب کے سب دور جاہلیت والے تھے۔ وہ مسلمانوں کو دور جاہلیت کی طرف پلٹانے اور اسلامی اقدار کی جگہ دور جاہلیت کی اقدار واپس لانے کے عزائم رکھتا تھا۔ یہ ہیں وہ چند عنوانات جن کی ایام عاشورا میں دوسرے چہرے کے حوالے سے وضاحت کرنے کی ضرورت ہے۔

☆۔ واقعۂ کربلا کا تیسرا چہرہ خود امت اسلامیہ ہے۔ پوری تاریخ بشریت میں رہبرانِ صالح اور رہبران فاسد دونوں نے ایک دوسرے کے خلاف جنگ، نبرد آزمائی اور مقابلے میں اقوام و ملل کو بطور اسلحہ استعمال کیا ہے۔ جو بھی اپنے افکار و نظریات سے اقوام و ملل کو اپنی طرف مائل کرنے میں کامیاب ہوا وہی دوسرے پر غلبہ حاصل کر لیتا ہے۔ اس غلبے کو حاصل کرنے میں بنیادی کردار امت کا ہوتا ہے۔ لہٰذا خداوند متعال نے انبیاءؑ کو ہمیشہ امتوں کی طرف بھیجا۔ چنانچہ قرآن مجید میں آیا ہے کہ: ''ہم نے ہر امت میں ایک رسول بھیجا'' یا ''ہر رسول کو اُسی قوم کی زبان میں بھیجا''۔ امام حسینؑ نے بھی

اپنے ابتدائی منشور اور قیام کے بارے میں وضاحت کرتے ہوئے یہی فرمایا کہ میں امت جد کی اصلاح چاہتا ہوں۔ چنانچہ پہلے دن سے لیکر آخری لمحات تک آپؑ کا خطاب امت سے ہی تھا۔ لیکن امت کے بارے میں کچھ کہنے سے پہلے کسی بھی جنگ میں کرداروں کاذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں :

۱۔ خود فکر جس کی طرف دعوت دی گئی ہے اس میں کتنی طاقت اور وزن موجود ہے۔

۲۔ داعی کی شخصیت۔

۳۔ اس امت کی ذہنیت 'اس کی سوچ اور فکری رجحانات۔

آیئے واقعہ کربلا کے تناظر میں ایک ایک کر کے ان تمام عوامل کا جائزہ لیتے ہیں :

واقعۂ کربلا میں جو فکر ہے وہ اسلام ہے یعنی اسلام حقیقی کی طرف دعوت ہے' جاہلیت کے خلاف نبرد آزمائی کا اعلان ہے۔ اس فکر میں جو وزن و طاقت ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ اسے سب تسلیم کرتے ہیں۔ موافق و مخالف اور غیر جانبدار گروہ سب اس فکر کے قائل ہیں۔ بقول مولانا مودودیؒ : اس وقت کے اصحاب و تابعین میں سے کسی نے بھی امام حسینؑ کی آواز اور دعوت کو غیر شرعی قرار نہیں دیا۔ گرچہ انہوں نے انکا ساتھ دینے میں کوتاہی کی۔

دوسرا کردار داعی کا ہے۔ اس سانحہ میں داعی کوئی عام شخص نہیں بلکہ نواسۂ رسولؐ امام حسینؑ ہیں جو اپنے دور کی عظیم ترین شخصیت ہیں۔

تاریخ اسلام میں پیغمبر اکرمؐ کے بعد کوئی ایسی شخصیت سامنے نہیں آئی جو امت اسلام میں حسینؑ جیسی غیر متنازع شخصیت کا مالک ہو۔ حد یہ ہے کہ خود کربلا میں امام حسینؑ کو محاصرہ کرنے والے گروہ کی اکثریت امامؑ کی عظمت و بزرگی کی معترف تھی۔

ان دو حقائق کو سمجھنے کے بعد ہمارا اصل موضوع گفتگو اس وقت کی امت کی

ذہنیت کے بارے میں ہے۔ اسے سمجھنے کیلئے مختلف زاویوں سے بحث و گفتگو کرنے کی ضرورت ہے تاکہ یہ معلوم کیا جاسکے کہ آخر اس واقعے میں اس وقت کی امت نے کیا کردار اپنایا، کس فکر و سوچ میں مبتلا تھی۔

(۱۔۳) پوری امت اسلامی اس حقیقت کی معتقد و معترف تھی کہ پیغمبر اکرمؐ کے اہل بیتؑ اور آپؐ کی ذرّہ طیبہؑ سب کیلئے واجب الاحترام ہیں۔

(۲۔۳) امام حسینؑ مدینہ سے نکلنے کے بعد ۳ / شعبان کو مکہ پہنچے جو امت اسلامی کی آمد و رفت کا مرکز ہے۔ اس لئے یہاں وقوع پذیر ہونے والے واقعات و حوادث جلد ہی اقطار اسلامی میں منتشر ہو گئے۔ چنانچہ امام حسینؑ کا یزیدی خلافت سے اختلاف، اس پر نارضامندی اور بیعت سے انکار کی خبریں جلد ہی تقریباً تمام اطراف میں پہنچ گئیں بالخصوص اہل مدینہ جن کو امام حسینؑ اپنے پیچھے چھوڑ کر آئے تھے، اہل بصرہ بھی جن کے بزرگان و زعما کو امامؑ نے خط کے ذریعہ اپنے موقف سے آگاہ فرمایا تھا۔ یمن بھی مکہ سے قریب ہی تھا۔ بحیر ابن یثار نے یزید کیلئے بھیجا تھا امام حسینؑ نے اثنائے راہ میں اسے روکنے کے بعد وہاں سے واپس جانے والوں کے توسط سے اہل یمن کو بھی حقیقت حال سے خبردار کر دیا تھا۔ مکہ سے سرزمین کربلا پہنچنے تک راستے میں موجود بادیہ نشین اور دیگر آبادی کے سب لوگوں کو امامؑ کے مکہ چھوڑنے اور کوفہ کی طرف سفر کی خبریں، سب نے سن لی تھیں۔

☆۔ اس واقعہ میں شامل آخری گروہ اہل کوفہ ہیں۔ انہوں نے پہلے امامؑ کو دعوت دی اور جب آپؑ نے اپنے نمائندے کو وہاں بھیجا تو اس کی نہایت عزت و احترام سے پذیرائی کی۔ لیکن جب انکی دعوتی اور اس طرز عمل کے نتیجے میں امام حسینؑ انکی طرف متوجہ ہوئے تو بجائے اسکے کہ یہ لوگ امامؑ کے استقبال

کیلئے آگے بڑھتے تیس ہزار کا لشکر جسے کوفہ سے باہر حسینؑ کے استقبال کیلئے نکلنا تھا اسی نے امام حسینؑ کو شہر میں آنے سے روکا اور چاہا کہ امامؑ کو گرفتار کر کے عبید اللہ بن زیاد کے سامنے لیجائیں' اسکے ہاتھوں میں بیعت کریں اور بعد میں یزید تک لیجائیں۔ یہ امام حسینؑ کیلئے ممکن نہ تھا۔ یہ اس وقت کی امت کی صورتحال تھی۔ ایسی صورتحال کو سامنے رکھتے ہوئے مندرجہ ذیل موضوعات پر امت کے بارے میں گفتگو کرنے کی ضرورت ہے :

۱۔ آیا امت اسلامی شخصیت امام حسینؑ کو نہیں جانتی تھی ؟

۲۔ اس وقت کیا امت بالخصوص اہل کوفہ دین ومذہب اسلام کو چھوڑ چکے تھے ؟

۳۔ اہل کوفہ کو کیا حسینؑ کی شخصیت اور کسی اور کے درمیان اشتباہ ہوا تھا ؟

۴۔ کیا اہل کوفہ کو امام حسینؑ کی شخصیت سے کسی قسم کا شکوہ' شکایت اور گلہ وغیرہ تھا ؟

۵۔ آیا امام حسینؑ انکو نئی مصیبت وپریشانی اور فساد میں مبتلا کرنا چاہتے تھے جو انہیں ناگوار گزرا ؟

٦۔ معاویہ ویزید دونوں خلافت اسلامی پر قابض ہوئے' دونوں نے اقدار اور افکار اسلامی کو منہا کیا' بیت المال مسلمین پر قابض ہوئے' شخصیات برجستہ اسلامی کو چن چن کر شک وگمان کی بنیاد پر شہید کیا ان حوالوں سے امام حسینؑ کیلئے دونوں میں چنداں فرق نہیں تھا' تو کیوں کر آپؑ نے معاویہ کے خلاف ایسا قیام نہیں کیا ؟

ایک امت جس کا ضمیر مردہ ہو اور حس ختم ہو چکی ہو' ایسی امت سے امید رکھنا اور ان پر بھروسہ کر کے ایک بڑی طاقت وقدرت پر قابض حکمران کے خلاف قیام کرنا کس حد تک دنیائے سیاست دان' جامع شناس اور خود شریعت اسلامی کے اصول وموازین کے تحت صحیح گردانا جاسکتا ہے۔

یہ تھے کربلا کے تین اہم عناصر کے سرسری اور ظاہری چہروں کے بارے میں عنوان گفتگو۔

عنوان عاشورا کا چوتھا عنوان اسلام ہے۔ عناصر سہگانہ کی وضاحت کرنے کے بعد یہ دیکھنا ہے کہ یہ تین اطراف یعنی امام حسینؑ' یزید اور ملت اسلامیہ ہیں۔ تینوں کے کیا اہداف اور مقاصد تھے؟ اگر تینوں کے مقاصد واحد و مشترک تھے تو یقیناً یہ معاملہ خود میدان جنگ میں مخل ہو جاتا اور آپس کی کدورت' مخالفت صلح و آشتی میں تبدیل ہو جاتے۔ لیکن بد قسمتی سے تینوں میں سے ہر ایک گروہ الگ مقاصد واہداف رکھتا تھا۔ ہر ایک اپنے مقاصد کیلئے سوچتا تھا' اسی کیلئے حرکت کرتے تھے اور اسی کیلئے بولتے تھے۔ ہر ایک اپنے مقصد وہدف کو مرکزیت دینے اور محور بنانے کا خواہش مند تھا۔ یزید کی پوری خواہش تھی کہ وہ دور جہالت کی اقدار کو زندہ کرے اسی لئے ہر ممکن کوشش کر رہا تھا کہ دور اقتدار کے توسط سے دور جاہلیت واپس لائے اور جاہلیت کے مخالف گروہ معاشرے سے ختم کر دیئے جائیں۔ کیونکہ اسکی نظر میں اس وقت جاہلیت کے خلاف نبرد آزما شخصیت محض حسینؑ ابن علیؑ تھے لہٰذا سب سے پہلے تیر کا نشانہ حسینؑ ابن علیؑ کو بنایا۔

☆۔ دوسرا گروہ اس وقت کی امت اسلامی تھی۔ ان میں سوائے عدد قلیل کے سب کا ہدف یہ تھا کہ کسی بھی قیمت پر جینے کو ہاتھ سے نکلنے نہ دیں۔ ہر چیز جینے پر قربان ہو سکتی ہے لیکن جینا کسی چیز پر قربان نہیں کیا جاسکتا چاہے دینی معاملہ ہی کیوں نہ ہو۔ یہی وجہ ہے اگر جینے کی راہ میں اور حسینؑ کا ساتھ دینے میں کوئی تصادم و مخالفت نہ ہوتی تو یقیناً امام حسینؑ کا ساتھ دیتے لیکن انکی بد قسمتی انہیں یہ نظر آیا کہ حسینؑ کا ساتھ دینے پر جینے سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔ جبکہ افراد امت جینا چاہتے تھے۔ لیکن امام حسینؑ نے ایسے جینے کو ہلاکت قرار دیا

ہے اور ہر شخص مومن کیلئے ایسے حالات میں مرنے کو ترجیح دیا ہے۔

☆۔ تیسرا فریق خود حسینؑ ابن علیؑ ہیں۔ حسینؑ کے نزدیک ہدف اسلام ہے اور اسلام کو ہی اپنے لئے اعلیٰ وارفع ہدف گردانتے ہیں اور اس کو اتنا عظیم وگراں بہا سمجھتے ہیں کہ اس کیلئے جتنی بھی امت کی برجستہ اور چیدہ شخصیات ملیں انکے لہو کو اس درخت کی آبیاری اور شادابی کیلئے مفید سمجھتے ہیں۔ وہ اس درخت اسلام کی بقاء اور حیات جاودانی کیلئے اپنے اعزاء اور خود اپنے لہو کو ناچیز گردانتے تھے۔ یہ منطق حسینؑ کی سفیرہ ونمائندہ کربلا خواہر عزیز زینبؑ سے سنئے۔جب مقتل میں پہنچیں تو زینبؑ نے فرمایا: اے پروردگار! تیری درگاہ میں ہماری یہ قلیل قربانی قبول فرما۔

کربلا میں حسینؑ کا ہدف۔ اور عنوان بقائے اسلام تھا تو مجالس عزاء میں اس وقت اسلام کو عنوان قرار دینا چاہئے۔اس وقت اسلام کے کیا کیا قوانین ‘عقائد اور اخلاق معاشرے میں متروک ہیں۔ آیا ہماری نسل اسلامی عقائد سے آشنا ہے ؟ آیا ہمارے مرد ‘عورت ‘ بچے اور جوان سب اسلامی اخلاق کے اعلیٰ اقدار کے پیرو ہیں ؟ آیا ہماری سیاست اور ہمارے سیاست مدار ‘سیاست اسلامی کے اصول کے پابند ہیں ؟ آیا ہمارے معاشرے کے اجتماعات نظریۂ اسلامی پر مشتمل ہیں یا دنیائے لادینیت اور سامراجیت کے اصولوں کے تحت ہیں ؟ آیا ہماری ثقافت اسلامی ہے یا مغربی ؟ ہمارے معاشرے میں اس وقت بے حجابی ‘حرام خوری ‘سود خوری ‘ملاوٹ کاروباری زندگی میں ہیر پھیر وغیرہ کی یلغار اسلامی اقدار کو چیلنج کررہے ہیں للکار رہے ہیں۔ اگر ہم یہ کہیں کہ اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد ‘اسلام پر کربلا کا احسان تو ہے لیکن آج مجالس ومنابر حسینی سے اسلام کو اس وقت درپیش مسائل کو عنوان عاشورا میں جگہ دیکر ذکر نہ کرینگے تو یہ کہاں بیان ہوگا۔ یہ منابر فرقہ پرستی

کیلئے نہیں ہیں۔ یہ فرقہ گرائیوں کی دفاع کی جگہ نہیں۔ یہ جگہ دعوت بہ اسلام کی ہے چنانچہ ہمیں اسلام کی طرف دعوت دینا چاہئے اور کہنا چاہئے کہ ہمارے اسلام میں آپ کو کیا اشکال ہے۔ حسینؑ کی بھی یہی منطق تھی کہ کیا ہم مسلمان نہیں ہیں ؟ کیا ہمارے اسلام میں شک ہے ؟ حسینؑ فرماتے ہیں آیئے ہم سب جمع ہو جائیں' اسلام کو خطرہ ہے۔ لہٰذا اگر امامؑ کے عنوان واقعی اور حقیقی بلکہ خلاصۂ حرکات' اقوال' خطبات اور جوابات کو نچوڑیں تو واقعۂ کربلا کا عنوان اسلام ہے اور اسلام سے ذرّہ بھر ولو حرف واحد سے انحراف عنوان عاشورا سے انحراف ہے۔

عنوان عاشورا سے غیر مناسب موضوعات

عنوان عاشورا سے انحراف

سابق سطور میں ہم یہ بات واضح کر چکے ہیں کہ عنوان عاشورا کے مخصوص چہرے ہیں اور ہر چہرہ اپنے مخصوص اہدف و مقاصد رکھتا ہے۔ مجالس امام حسینؑ میں حسینؑ و قیام امام حسینؑ کی شناسائی کیلئے ضروری ہے کہ انہی مخصوص چہروں کا تعارف کریں اور ان کے اہداف پر روشنی ڈالیں۔ اس کے علاوہ کوئی اور عنوانات پر گفتگو کو اگرچہ اپنی جگہ صحیح گردانا بھی جائے تب بھی یہ ایک قسم کی اہداف امام حسینؑ سے نظروں کو ہٹانے کی ایک سازش ہو گی۔ اس سلسلے میں ہم چند رائج موضوعات کی طرف قارئین کو متوجہ کرنا چاہیں گے تاکہ ہماری مجالس و محافل کی سمت اصل ہدف امام حسینؑ کی طرف مرکوز رہے۔

۱۔ مجالس امام حسینؑ میں صدر اسلام کی جنگوں احد' خندق' خیبر' بدر' احزاب جو اسلام اور مشرکین کے درمیان لڑی گئیں ان میں اسلام کی نمائندگی پیغمبر اکرم کر رہے تھے اور مشرکین کی طرف سے ابو سفیان۔ ان جنگوں میں دیگر

اصحابِ باوفا کے ساتھ سر فہرست مولا علیؑ کا مقام ہے۔ یہ اپنی جگہ ایک حقیقت ہے لیکن یہ جنگیں اسلام اور مشرکین کے درمیان تھیں ۔ ان واقعات کو کربلا کی جنگ میں عنوان کے طور پر اپنانا اس جنگ کے فریقین کے اہداف سے نظروں کو ہٹانے کے مترادف ہے۔

۲۔ قصۂ ایمانِ حضرت ابو طالبؑ ایک عنوان ہے۔ ایمان ابو طالبؑ اختلافی موضوع کا ایک حصہ ہے۔ آیا انبیاءؑ و آئمہ ُطاہرینؑ کے والدین' آباؤ اجداد مشرک یا کافر ہو سکتے ہیں یا نہیں ؟ شیعوں کا عقیدہ ہے آیات و روایات کی روشنی میں کہ انبیاء اور ائمہ طاہرینؑ کے آباؤ اجداد کا موحد ہونا ضروری ہے۔ اس پر گفتگو کا اپنا موقع و محل ہے۔ کثیر تخمیں نشر و اشاعت کے ذریعے ہوئی ہیں اور ہو رہی ہیں۔ اس کو واقعۂ کربلا کے ایام میں عنوان قرار دینا در حقیقت یہ بھی عنوان عاشورا کو پس پشت ڈالنے کی ایک دوستانہ شکل کی سازش ہے۔

۳۔ بناۃ النبیؐ یعنی پیغمبر اکرمؐ کی ایک بیٹی ہے یا چند بیٹیاں۔ اگر بنیاد فضیلت ہے تو ہو کوئی وراثت تو نہیں ہے۔ انسان کے کسبی فضائل کے علاوہ خدا کی ایک خاص الطاف و عنایات ہیں خداوند عالم نے بالاتفاق امت اسلامی میں فضیلت صرف زہراءِ مرضیہؑ کو دی ہے جس میں کوئی محل اختلاف نہیں۔ اس کے باوجود اسے عنوان بنانا مسائل اختلافی کو اچھالنے ' فروغ دینے اور انتشار پیدا کرنے کی ایک سازش ہے۔

۴۔ قیام امام حسینؑ اسلام حقیقی 'اسلام محمدیؐ کے مکدر چہرے سے گرد و غبار کو ہٹانے اور اس پر بنوامیہ کے توسط سے لگے ہوئے داغ کو دھونے کی ایک کوشش ہے۔ اس کے علاوہ یزید کی دور جاہلیت کو پلٹانے کی مہم کے خلاف امام حسینؑ کا ایک مزاحمتی عمل ہے۔ حسینؑ ابن علیؑ نے ہر قسم کی جاہلیت

کے خلاف اعلان جہاد فرمایا ہے۔ چاہے قدیم دور کی جاہلیت مشرکین ہو یا جدید مشرکین مغرب کی جاہلیت ہو۔ جاہلیت جاہلیت ہے لیکن حسینی مجالس میں مسلمانوں کے اندر حقارت کے احساسات پیدا کرنا اور انہیں مغرب والوں کے بارے میں عظمت بزرگی اور انکے بارے میں نرم دل یا ان سے مرعوب وغیرہ کے احساسات پیدا کرنا غرض ہر قسم کی انکے بارے میں تعریفِ مجالس امام حسینؑ میں عنوان عاشورا کے خلاف ہیں۔

۵۔ قیامِ امام حسینؑ امت اسلامی کے تمام گروہوں کو کلمۂ اسلام پر متحد ہونے کی ایک دعوت سے شروع ہوا۔ اور اس راہ میں امامؑ نے شہادت دی۔ ہمارے ملک میں اس وقت جو فرقہ واریت کے شعلے بلند ہو رہے ہیں۔ ان مجالس میں فرقہ واریت کے شعلوں کو مزید ہوا دینا در حقیقت عنوان عاشورا کے خلاف سازش ہے۔

٦۔ ذمہ داریوں سے آزاد کرنے والی گریہ وبکاء : مصائب امام حسینؑ پر رونے رلانے یا رونے جیسی صورت بنانے کے بارے میں وارد روایات سے ہمیں نہ انکار ہے اور نہ اختلاف لیکن کلام کے صدر و ذیل کو اُلٹ پلٹ اور کم و کاست کر کے مثل یزید اپنے مقاصد نکالنا شیوۂ باطل ہے۔ یزید تو یہی کہتا تھا کہ خداوند عالم نے ''لاتقرب الصلوٰۃ'' کہا ہے ''لا تقرب الخمر'' نہیں کہا ہے۔ کتب روایت میں سے کسی بھی موضوع کے بارے میں وارد روایات کی اصل، لغت عرب کے حوالے سے اس کلمہ کا معنی، کلام کے صدر و ذیل اور شان نزول نیز پس و پیش سب کو سامنے رکھتے ہوئے معانی کریں اور یہ دیکھیں کہ آئمہ اطہارؑ نے اس سے کیا مراد لیا ہے اور اس کو کیوں اہمیت دی ہے اور کس موقع پر کہا ہے؟

مجالس امام حسینؑ میں گریہ وبکاء کے تمام قرائین، پس و پیش لفظی اور معنوی

'شان نزول اور اس کے اہداف و مقاصد سب کو پس پشت ڈال کر پہلے مرحلے میں اس کو ایک مستقل فریضہ کے طور پر پیش کیا ہے۔ دوسرے مرحلے میں اس کو انجام دینے کے بعد دیگر تمام واجبات کو ساقط اور محرمات کو مباح گردانا ہے۔ تیسرے مرحلے میں اس کو فروغ دینے کی خاطر مجالس امام حسینؑ میں مصائب سازی کی ظاہر و پوشیدہ درسگاہیں قائم کی ہیں۔ اس کے خلاف بولنا اور ان ناپاک عزائم کو روکنا یقیناً ان لوگوں کو برا لگے گا جو اس سے مستفیض ہو رہے ہیں۔ انکے لئے تو بات بنتی ہے۔ لیکن اس سلسلے میں جن لوگوں کو فائدہ نہیں پہنچتا ہے ان کی بھی اس مزاحمت سے نالاں ہونے کی کوئی منطق سمجھ میں نہیں آتی۔ غرض گریہ و بکاء کے جو مقاصد آئمہؑ نے نظر میں رکھ کر اس کے لئے اجر و ثواب بیان کیا ہے اس کی وضاحت ضروری ہے تاکہ صراحت ہو جائے کہ کونسے گریہ و بکا کیلئے اجر و ثواب ہے۔ کیونکہ ہر گریہ و بکاء اجر و ثواب کا مستحق نہیں بلکہ قابل مذمت اور بعض مواقع پر ممنوعیت بھی ہے۔

آیئے ذرا اس کی وضاحت کرتے ہیں اور ایک تجزیہ قائم کرتے ہیں۔

بکاء الف مقصورہ کے ساتھ یعنی بغیر مدّ کہیں تو صرف رونا اور آنسو بہانے کو کہتے ہیں اگر بکاء مد کے ساتھ ہو تو آواز کے ساتھ رونے کو کہتے ہیں جیسے رونا' سونا' جیسا کہ ارشاد رب العزت بھی ہے :

"وانه هو اضحك و ابكى"۔ (سورۂ نجم : ۴۳)

"اور یہ کہ وہی ہنساتا ہے اور وہی رلاتا ہے"۔

"اذا تتلىٰ عليهم آيات الرحمن خرّوا سجداً و بكيا"۔

(سورۂ مریم : ۵۸)

"جب ان پر رحمٰن کی آیات کی تلاوت کی جاتی تو وہ روتے ہوئے سجدے میں گر پڑتے"۔

رونا خواہ تنہا اشک کی صورت میں ہو یا بلند آواز بذات خود حسن نہیں رکھتا ہے۔ یہ مذمت کی بات ہے لہٰذا خدا نے اہل جہنم سے کہا کہ تم زیادہ روئے۔ جیسے :

"فلیضحکوا قلیلاً ولّیبکوا کثیرا"۔(سورۂ توبہ :۸۲)

"اب یہ لوگ ہنسیں کم اور روئیں زیادہ"۔

رونا دونوں صورتوں میں ایک ضعف یعنی کمزوری اور کمی کے احساس کے پیش آنے کے بعد ہوتا ہے۔ یعنی جو اس کو نہیں ملنے والے تھیں نہیں ملے تو اسے رونا نہیں آتا ہے۔ اسی طرح ملنے والے تھے لیکن نہیں ملا تب بھی رونا نہیں آتا۔ اس صورت میں کہ جب اسے کوئی ملنے کے بعد اس سے کھو جائے یا چھین لی جائے تب رونا آتا ہے۔ رونا در حقیقت ایک ایسی حالت ہے ایسی حس کا نتیجہ ہے جس میں انسان حیوان، حتیٰ نباتات تک برابر ہیں کہ اس کے اندر موجود نمی کو باہر سے کوئی حرارت ملے اور اس کو حرارت میں لائے تو اس سے رطوبتیں خارج ہوتی ہیں جیسے بچے کا رونا جہاں اسے کوئی احساس محرومیت نہیں ہے۔ بعض حیوانات بھی روتے ہیں۔ گیلی لکڑی کو جب آگ پر رکھیں گے تو دوسری طرف سے پانی چھینکے گی۔ اس طریقے سے انسان کو اپنے سے لاتعلق غیر مربوط بلکہ دشمن کو بھی کوئی ایسی دل خراش حالت میں دیکھے اس کے اندر کوئی عاطفہ کو حرکت میں لاتے ہیں اور اس کی نمی کو آنسو کی صورت میں خارج کرتے ہیں۔ لہٰذا ہر قسم کے آنسو آنا بافضیلت نہیں ہیں۔ یہ انسانی طبیعت ہے۔ چنانچہ اگر کسی کو آنسو نہیں آتے ہیں تو فطری طور پر اسے ناقص سمجھا جاتا ہے۔ آنسو نہ آنے والے انسان کو عام طور پر شقی کہا جاتا ہے لیکن وہ حقیقت میں شقی نہیں ہوتا ہے۔ شرعی حوالے سے آنسو نہ

آنے والے شقی نہیں ہوتے ہیں اسی طرح آنسو آنے والے سعادت مند بھی نہیں ہوتے۔ یہاں سے ہم آنسو کے بارے میں کچھ تقسیم بندی کریں گے۔

۱۔ محرکات عواطف انسانی کے تحت آنے والے آنسو کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہوتی۔ یہ عاطفۂ انسانی کے تقاضے میں جس طرح تیز دھوپ، ہوا، گیس وغیرہ سے آنکھ میں آنسو آجاتا ہے اسی طرح دل خراش مناظر اور کلمات سننے کے بعد ہر انسان کے آنسو آجاتا ہے۔ بہت سے انسان ایسے ہیں جو دشمنوں کے قتل ہونے کی یا ان کو ملنے والی سزاؤں کی خبریں سن کر رو دیتے ہیں اسی طرح اہل بیتؑ پر گزرنے والے مصائب اور دلخراش مناظر دیکھ کر دشمن بھی بے تابانہ رو پڑے۔ چنانچہ مقاتل میں لکھا ہے: حضرت زینبؑ نے امام حسینؑ کی قتل گاہ میں نعش مطہر پر آکر حسینؑ سے خطاب کیا تو کہتے ہیں عمر سعد سمیت بہت سے لشکری منہ پھیر کر جناب زینبؑ سے شرمندہ ہو کر رونے لگے۔ ایسے رونے اور آنسو کے قطرات کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ یہ مگرمچھ کے آنسو ہیں۔

۲۔ انسان کے دوش پر جو فرائض و ذمہ داریاں ہیں انہیں نظر انداز کر کے یا بے اہمیت گردان کر رونے کو ایک وفاداری کے شعار کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ ایسے رونے والوں کی شان میں جہاں سورۂ توبہ کی آیت ۸۲ میں ہے وہاں عقیلۂ قریش جناب زینب کبریٰؑ نے رونے سے منع نہیں کیا بلکہ فرمایا: اب تو رونا تمہارا مقدّر ہے۔ تم نے اپنے آپ کو بدبختی میں ڈالا ہے۔ ذمہ داری سے پہلو تہی کرنے کے بعد ایسے رونے کا کیا فائدہ۔ دیکھو یہ اہل کوفہ کس پر رو رہے تھے؟ حسینؑ پر یا اہل بیتؑ پر؟ جن سے حضرت زینبؑ نے فرمایا: تمہارے رونے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ آج کل بہت سے لوگ ایسے بھی ہیں جو سال بھر میں کچھ آنسو بہا کر اپنے آنسو کو نماز، روزے، حج، جہاد، امر بالمعروف و نہی

عن المنکر کا صرف بدل قرار ہی نہیں دیتے بلکہ عمر بھر کھانے والے لقمۂ حرام کو بھی اس آنسو سے دھو کر حلال و پاک کرنا چاہتے ہیں۔

۳۔ رونا کبھی جذبہ اور حرارت کو ٹھنڈا کرنے کی خاطر ہوتا ہے۔ یہ خود تجزیاتی طور پر دشمن کے مقابل میں رونا ایک نقص و عیب ہے جو جذبے کو ٹھنڈا کرتا ہے۔ چنانچہ جنگ بدر میں مشرکین بہت سی جانیں کھو دینے کے بعد پسپا ہو کر واپس مکہ گئے تو انہوں نے اپنے مقتولین کے وارثین کو رونے سے منع کیا تاکہ جذبۂ انتقام سرد نہ پڑ جائے۔

مجالس امام حسینؑ میں ایسے آنسوؤں سے کیا فائدہ کہ لوگ محرم کے ایام گزرنے کے بعد دلہا دلہن کی طرح سجتے ہوں، شادی حال و نیلام گھر آباد کرتے ہوں لیکن اسلام اور مسلمین پر گزرنے والے مصائب و آلام پر بے توجہی اور لاتعلقی برتتے ہوں بلکہ ایسے مسائل کو سننا نہیں چاہتے۔ ایسے آنسو کسی کام کے نہیں۔

۴۔ گریۂ حرکت آور یعنی رونے والے کے آنسو یا صدا ناظرین و مستمعین کو جنبش میں لانے اور متحرک کرتے ہیں کیونکہ یہ گریہ عام مصیبتوں اور محرومیوں کی بنیاد پر رونے سے مختلف ہے۔ عام مصیبتوں میں مصیبت زدہ شخص اس نقص و عیب اور بلا کا جبران ہونے یا بھول جانے تک اس پر گریہ کرتے ہیں۔ کائنات کا نظام بھی ایسا ہے کہ ہمیشہ دگر گونی یعنی تغیر پذیر ہوتا ہے اور بہت سے خلاء پُر ہو جاتے ہیں یعنی نعمت میں تبدیل ہوتا ہے یا عادی ہونے کے بعد اسے بھول جاتا ہے۔

دوسرے افراد بھی اس کے ساتھ حزین و ہم گریہ ہو جاتے ہیں تاکہ جلدی سے تسکین ہو جائے اور وہ اپنی پہلی حالت یا طبیعی حالات میں واپس جائے۔ جبکہ امام حسینؑ

پر ہمارے گریہ سے خود امامؑ کو کوئی فائدہ نہیں ہو گا کیونکہ سید الشہداؑ رضوان خدا میں ہیں اور رضوان خدا سے بڑھ کر کوئی نعمت ہی نہیں۔ یہ گریہ ان کی کوئی خلاء یا کمی کو پُر نہیں کرتے بلکہ ہمارے خلاء اور نقص کو پُر کرتے ہیں۔ ہمارا خلاء رہبر صالح 'امام عادل' پیشوائے رؤف و مہربان کا فقدان ہے 'اس سے محرومیت ہے جو اب تک جاری ہے اس خلاء اور محرومیت کو پُر کرنے کے دو ہی ذرائع ہیں:

۱۔ غیر صالح رہبروں 'ظالموں' جابروں اور جنایت کاروں سے نفرت اور ہماری یہ فریاد و فغاں 'رونا' آہ و حسرت انہیں شرمندہ اور محصور کریں گے۔ اجتماع میں اور آئندہ انہیں ظلم و جنایت کی طرف زیادہ بڑھنے کی جرأت نہیں ہو گی۔ چنانچہ اہل بیتؑ کے رونے سے حکومت وقت بنو امیہ بے چین اور پریشان تھی۔

۲۔ تمام حق طلب 'عدالت خواہ' ظالموں سے نفرت اور امام مقتدائے صالح کی تلاش کرنے والے 'حق و انصاف کا رواج چاہنے والے ان رونے والوں کے ساتھ مل جائیں گے۔ چنانچہ مجلس عزا کا فلسفہ آئمہؑ نے اپنے ماننے والوں اور معتقدوں کے اجتماع کو قرار دیا ہے۔ مجالس کا اجتماع اس لئے پسند ہے کہ اسی نام سے انکے چاہنے والے اسلام پسند یا مسلمان سب اسی نکتہ پر متفق ہو جائیں گے اور ایک اجتماعی طاقت بنیں گے اور اجتماعی طاقت سے خود بخود حق عدالت اوصاف حمیدۂ آئمہؑ کو فروغ ملے گا۔ ضلالت 'گمراہی 'بطالت اور شرارت خود بخود معاشرے سے ختم ہو جائیں گے اور رفتہ رفتہ یہ ایک اجتماعی نظام عدل عالمین سے نزدیک ہو جائے گا۔ لیکن عزاداران بخوبی واقف ہیں کہ انہیں دلائل سے ثابت کرنے کی ضرورت نہیں پڑے گی کیونکہ ان کا روز مرہ کا مشاہدہ ہے کہ اس وقت قومیت 'گروہ بندی' ذاتی تناؤ 'افتراق یا خاندانی روایات یا دوسرے کی مزاحمت یا اپنی ذاتی خواہش اور دنیائے ذلیل

وخوار کی ناپاک خواہشات وعزائم کیلئے مجلس عزا کو استعمال کرتے کرتے تشیع اور دوست داران اہل بیتؑ کا اجتماع ہر آئے دن پاش پاش اور منتشر ہو رہا ہے۔ یہ انتشار اتنا نمایاں ہو چکا ہے کہ ان کا کسی پرچم تلے جمع ہونا ممکن نہیں۔ وہ پرچم کبھی جس کے تلے لوگ جمع دکھائی دیتے تھے، آج گلی گلی میں نصب ہوئے ہیں اور یہ صورت حال گلۂ گوسفند کی اس بھیڑ کی مانند ہو گئی ہے جو چراگاہ میں محدود گنتیوں میں منتشر ہوتے ہیں۔ اب بھیڑیوں کیلئے ان کا شکار کرنا، چیرنا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ اس حدیث رسولؐ کے مطابق نام حسینؑ یاد حسینؑ جو ہمیں راہ ہدایت دکھانے والا تھا، جس کشتی میں سوار ہو کر ہم ساحل نجات تک پہنچنے والے تھے ہر آئے دن موجوں میں بلکہ خون کی، الحاد کی، بے دینی کی موجوں میں ڈوب رہے ہیں۔ للذا جو گریہ کا تصور ہم نے پیش کیا ہے اس گریہ کے قطرات نے خود عزاداریٔ امام حسینؑ کو بہا دیا ہے۔ کیونکہ آنسو کی خاطر حقیقی مصائب کو کنارے رکھ کر جعلی مصائب نے جگہ لے لیا ہے اور خود عزادار کو بھی لے ڈوبا ہے۔ کونکہ فلسفۂ قیام امام حسینؑ کے بجائے مجالس امام حسینؑ میں انہی جھوٹے مصائب پر بہانے والے آنسوؤں کو فروغ ملا ہے۔

تفاسیر و توجیہات عنوان عاشورا

واقعۂ عاشورا کے فریق اجزائے ترکیبی، رسالت اسلام کی مثالی شخصیت حسینؑ ابن علیؑ اور اس کے بالمقابل جاہلیت کی مثالی شخصیت یزید ابن معاویہ ہے۔ دونوں کے واسطے سے ایک کو فتح وکامیابی سے ہم کنار کرنے اور دوسرے کو شکست سے دوچار کرنے والی امت اسلامیہ کے چہروں کا تعارف کرنے کے بعد اگلا مرحلہ عنوان عاشورا کی تفصیلات، توجیہات اور تاویلات کے بارے میں آتا ہے۔ کسی

بھی واقعہ اور حادثہ کے بارے میں تفاسیر و توجیہات بھی اصل واقعے کی مانند کسی عوامل، اسباب و محرکات کی بنیاد پر ہوتے ہیں۔

۱۔ معاندین جو اس واقعہ اور اسلام کی رسالت کی محافظت کے مخالف ہیں وہ اُس وقت سے لے کر دور حاضر تک، اس فکر سے اختلاف رکھنے والے، یہ کوشش کرتے رہے ہیں کہ واقعہ کے چہرے کو جتنا بھی ہو سکے مسخ کریں۔ حقیقت کو اگر جھٹلا نہ سکیں تو غلط تفسیر کر کے اسے غیر مؤثر قرار دیں۔ معاندین یہ عمل خالص واضح اور آشکار صورت میں اپنی دشمنی کا اعلان کرتے ہوئے اس واقعہ کے خلاف بولیں گے اور اپنے مدعا کیلئے دلائل و شواہد پیش کریں گے۔

۲۔ وہ اپنے ان مذموم عزائم کو امام حسینؑ کے ماننے والے سادہ لوح اور سادہ ضمیر انسانوں کے درمیان گھس کر، انکے ہمنوا و ہم خیال بن کر، یہ تفسیر اُن کی زبان سے جاری کریں گے۔ اس سلسلے میں اعداد و شمار سے زائد نمونے اور مثال عنوان عاشورا پر آپ کو کتب، مطبوعات، علاقائی رسومات اور شعراء کے اشعار کی صورت میں ملیں گے جیسے واقعۂ کربلا میں پیش نہ آنے والی جعلی حکایتیں، قصے، کہانیاں وغیرہ......

۳۔ قیام امام حسینؑ کی اصلیت کو تسلیم کرنے کے بعد، ان کے قیام کے اہداف و مقاصد کو اپنے باطل اور غلط عقیدے سے ہم آہنگ کر کے پیش کرنا مثلاً امام حسینؑ امت کے گناہوں کے بدلے میں یا انہیں بخشوانے کیلئے شہید ہوئے ہیں اور امام حسینؑ کا مختلف زاویے سے حضرت مسیحؑ سے مقابلہ و موازنہ کر کے پیش کرنا وغیرہ......

۴۔ صحیح تفسیر کو غلط رنگ میں پیش کرنا مثلاً:

(الف) امام حسینؑ نے اس وقت کے حالات، امت کی سلامت پسندی، مردہ ضمیر

ووجدان کی صورت حال کو سامنے رکھ کر خود ہدف کے حصول کی راہ میں تن تنہا شہادت کو ترجیح دیا۔ یہاں شہادت کو ہدف بنانا صحیح تفسیر کو غلط رنگ میں پیش کرنے کے برابر ہوگا۔ شہادت تنہا کسی بھی منطق کے تحت کوئی معقول پسندیدہ ہدف نہیں بلکہ وسیلہ برائے حصول ہدف ہے ورنہ خود کشی بھی پسندیدہ ہونا چاہئے' جبکہ اسلام نے اسے ہلاکت قرار دیا ہے۔ لہٰذا شہادت بذات خود ہدف نہیں بن سکتی۔ شہادت کو اس وقت پسندیدۂ خدا اور قابل قدر عمل شمار کرتے ہیں جب اس کا ہدف اعلیٰ ہو۔ امام حسینؑ بھی شہادت کیلئے آمادہ ہوئے کیونکہ امامؑ اعلیٰ وارفع ہدف کے حصول کے خواہاں تھے۔

(ب) عدل وانصاف کا قیام' شریعتِ خدا کا نفاذ' عقل' قرآن وسنت سب کے نزدیک مردِ مؤمن کیلئے پسندیدہ صفات ہیں۔ لیکن ان صفات کو اہل بیتؑ کیلئے حسینؑ کیلئے ناپسند اور شخصیت حسینؑ کیلئے نامناسب ہدف قرار دے کر دوسری طرف سے قیامِ امام حسینؑ کو بے ہدف یا غیر معقول ہدف میں تبدیل کرنا غلط رنگ میں پیش کرنا ہے۔

فضائل معنوی کو خصوصیات یا امتیازات مادّی کی شکل میں پیش کرنا

پیغمبر اکرمؐ کی رحلت کے بعد سے اب تک کتب اور علماء و محققین مکتب تشیع نے اہل بیت اطہارؑ بالخصوص آئمہ طاہرینؑ کے فضائل ومناقب میں علم وبشریت' علم معرفت خدا' دنیا ومافیھا سے مافوق زہد اور پارسائی کو دوسروں پر آئمہؑ کی خصوصیات میں بتائے ہیں۔ آئمہؑ کے فضائل معنوی اور مناقب اخلاقی کو انکے مقام خلافت ومنصب اور قیادت ورہبری کیلئے بنیاد قرار دیا تھا۔ تاریخ میں سینکڑوں مثالیں

ایسی ہیں جو آئمہؑ کے دور میں انکے ماننے والوں کو ہر قسم کے فقر و فاقہ ' محرومیت ' ضرب ' قصاوتِ زندانی کا سامنا رہا اور آخر میں شہادت انکا مقدر بنی۔ اسی بنیاد پر وہ اہل بیتؑ سے وابستہ تھے یا اس کی قیمت دی۔ اسی صورتحال کو پیش نظر رکھتے ہوئے اہل بیتؑ نے بر ملا لوگوں سے فرمایا جو ہم سے وابستہ ہو جائیں گے اور ہماری ولایت کے رشتہ میں آئیں گے انہیں بھوک و پیاس کیلئے آمادہ ہو کر آنا چاہئے اور فرمایا کہ جو ہم سے محبت کریں ' پہاڑ ہی کیوں نہ ہوں ' وہ متلاشی اور پاش پاش ہو جائیں گے۔ یہ تھے انکے فضائل و مناقب لیکن آج اس طریقے سے لوگوں کو اہل بیتؑ کی طرف اس ضمانت کے ساتھ دعوت دیتے ہیں کہ زندگی کی تمام مشکلات کا حل ان سے درخواست کرنے میں ہے ' ان سے مانگئے تو محروم نہیں لوٹے گا۔

عاشورا کا معطل شدہ عنوان

ہر واقعہ اور ہر حادثہ کی صحت و سقم پر سب سے مستند مصادر و مآخذ اس واقعے کے فریق یا اس سے نزدیک وابستہ حامیوں کے خطبات ' مکتوبات اور جوابات ہیں۔ واقعۂ کربلا بھی ایسے مستند مصادر و مآخذ ' معتمد و مستفیض سے خالی نہیں ہے۔ لیکن بد قسمتی سے مجالس امام حسینؑ پر قابض لوگ عمداً سوچے سمجھے یا غفلۃً ان مصادر کو پس پشت ڈال کر گزشتہ اوراق میں بیان شدہ غیر مناسب اور غیر مربوط عناوین کیلئے جگہ بنائے ہوئے ہیں اور ایام عزا میں اگر کوئی عنوان معطل ہے اور جس پر کوئی بحث و گفتگو نہیں ہو رہی ہے تو وہ خود عنوان عاشورا ہے۔ ہم یہاں قارئین کے توسط سے ولایت اہل بیتؑ و دوست داران اہل بیتؑ و شیفتگان امام حسینؑ و دل سوزان ملت تشیع سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ ایام عزا میں پہلی فرصت میں یہ ہدف بنائیں کہ واقعۂ کربلا کے اصلی مصادر و مآخذ کو خطیب ' ذاکرین ' شعراء و اہل انشاء اپنے مرثیے نوحے اور سلام کا ماخذ و مصادر قرار دیں۔ یہ خطبات آج بھی آپ کیلئے امام حسینؑ سے متعلق منسوب کتب میں میسر ہیں ' جن کے فہرست یہ ہیں :

۱۔ جب معاویہ نے آپؑ اور ابن عباس کو بلا کر یزید کی بیعت کی تجویز پیش کی تو اس کے جواب میں آپؑ کا خطبہ۔

۲۔ معاویہ کے دور میں سرزمین منیٰ میں علماء ' اصحاب اور تابعین سے خطاب

۳۔ جب معاویہ نے آپؑ کو ایک نرم ' تعریف اور دھمکی آمیز خط لکھا ' تو اس کے جواب میں آپؑ کا مکتوب۔

۴۔ دور معاویہ کے آخری ایام میں معاویہ کے خط کے جواب کی عبارت

۵۔ مدینہ چھوڑتے وقت امامؑ کا اپنے بھائی محمد بن حنفیہؓ کو لکھا ہوا وصیت نامہ۔

۶۔ مدینہ چھوڑ کر مکہ پہنچنے کے بعد آپؑ کا خط بصرہ میں موجود آپؑ کے والد

گرامیؑ کے دوست داران اور دور خلافت کی ذمہ دار شخصیات کے نام جیسے احنف بن قیس، یزید بن مسعود نہشلی وغیرہ۔

۷۔ مسلم بن عقیلؓ کے ساتھ امامؑ کا اہل کوفہ کے نام خط۔

۸۔ خطبۂ امام حسینؑ جسے سرزمین مکۂ مکرمہ سے عراق روانگی کے وقت آپؑ نے حرم خدا میں ارشاد فرمایا۔

۹۔ منزل ثعلبیہ سے اہل کوفہ کے نام آپؑ کا مکتوب۔

۱۰۔ دو خطبے ایک نماز ظہر کے موقع پر اور دوسرا نماز عصر کے موقع پر جب حُر ابن یزید ریاحی اور اس کے لشکر سے خطاب فرمایا۔

۱۱۔ دوران سفر آپؑ کے قیام و نہضت کے بارے میں ہونے والے سوالات و جوابات۔

۱۲۔ کربلا پہنچنے پر آپ نے تازہ ترین صورت حال سے اپنے اہل بیتؑ و اصحابؓ کو جمع کر کے آگاہ کیا۔

۱۳۔ جب لشکر عمر سعد نے اعلان جنگ کیا تو آپؑ نے رات کی مہلت طلب کر کے اپنے اصحاب سے خطاب فرمایا۔

۱۴۔ روز عاشورا آپؑ کے فرمان کے مطابق زہیر بن قینؓ اور بریر ہمدانیؓ کا لشکر عمر سعد سے خطاب۔

۱۵۔ صبح عاشور لشکر عمر سعد سے تین خطبے ارشاد فرمائے۔

۱۶۔ میدان جنگ میں ہر فریق اپنے موقف کو برحق ہونے کی سند میں یا تعارف میں جو اشعار پڑھتا ہے اسے رجز کہتے ہیں۔ جو رجز امام حسینؑ اور آپؑ کے اہل بیتؑ و اصحابؓ باوفا نے پڑھے ہیں۔

۱۷۔ جب اہل بیت اطہارؑ اسیر ہو کر بازار کوفہ میں پہنچے تو اس وقت امامؑ کی نمائندہ،

سفیرِ کربلا حضرت زینبؑ کا اہل کوفہ سے خطاب۔
۱۸۔ بازار کوفہ میں امام سجادؑ کا بحالت علالت بالائے پشت شتر سے اہل کوفہ سے خطاب۔
۱۹۔ حضرت زینبؑ کا عبید اللہ بن زیاد سے سوال وجواب کے کلمات۔
۲۰۔ جب اسرائے آل محمدؐ دربار اور قصر یزید میں پہنچے تو اس مجلس میں حضرت زینبؑ کا وہ جرائتمندانہ اور جہادی خطبہ جو آپؑ نے یزید کے سامنے برتر لہجہ میں ارشاد فرمایا۔
۲۱۔ مسجد اموی میں نماز جمعہ کے خطبہ کے بعد امام سجادؑ کا خطبہ۔
۲۲۔ جب اہل بیت اطہارؑ واپس مدینہ منورہ پہنچے تو دروازۂ مدینہ پر خیمے نصب کرا کے اہل مدینہ کے جمع ہونے کا انتظار کیا۔ اس موقع پر امام سجاد کا اہل مدینہ سے خطاب۔
۲۳۔ یہ خطبات ان ہستیوں کے ہیں جن کے کلام کی آرائش وزیبائش اور ان کی رنگینی دنیا کے دیگر شعراء اور خطباء جیسی نہیں کہ جس میں اپنی قومیت، عصبیت، فرسودگی، تکبر، غرور اور انانیت کی عکاسی ہوتی ہو۔
حسینؑ بن علیؑ کے خطبات کی سند آیات قرآنی اور قول رسول اللہؐ سے مرصّع ہے۔ ان خطبات میں کس حد تک آیات قرآنی مرکب ہیں۔
۲۴۔ وہ خطبات، مکتوبات اور جوابات جو مصادر اصلی وماخذ واقعی ہیں ان کو نظر انداز کر کے واقعۂ کربلا کے بارے میں سرسری طور پڑھی جانے والی تاریخی اسناد اور امامت کے بارے میں اپنے تصور کردہ معتقدات کے تحت جب تفسیر شروع کرتے ہیں تو اس میں مختلف تفاسیر بطور سازش، نادانی، عقیدت مندی، اجمال گوئی وغیرہ کے شامل کر دی جاتی ہیں۔ چنانچہ ضرورت اس امر

کی ہے کہ اصل تفاسیر کو بھی دلیل و منطق اور استدلال کے ساتھ ان منعقد ہونے والی مجالس میں بیان کیا جائے۔

۲۵۔اب قارئین خود غور فرمائیں کیا یہ سب مجالس عزاء سے معطل و متروک نہیں ہیں۔اگر ان خطبات کو عنوان قرار دے دیں تو مجالس امامؑ فکری سرمایہ سے کس قدر غنی اور صحت کے حوالے سے بے نیاز ہو جائیں گی۔ تہمتیں، اختراع، عداوتیں اور دشمنی خود بخود ختم ہو جائیں گی۔



امت کے ہزیمت خوردہ اخلاق کی اصلاح

مقالہ نگار : شہید باقر الصدرؒ

ترجمہ : علی شرف الدین موسوی

شہید آیت اللہ سید محمد باقر الصدرؒ نے سولہ اور سترہ صفر سنہ ۱۳۸۹ ہجری کو قیام امام حسینؑ سے متعلق دو خطبے دیئے جن کا عنوان "تخطیط الحسینی تغییر اخلاقیۃ العظیمہ" ہے۔ آپؒ فرماتے ہیں :

"امام حسینؑ کو امت اسلامی کو لاحق ایک ایسے مرض کا معالجہ کرنا پڑا جس طرح آپؑ کے برادر امام حسن مجتبیٰؑ کو ایک اور قسم کے مرض کا علاج کرنا پڑا تھا۔ امام حسنؑ کے دور میں امت مرض شک میں مبتلا تھی۔ یعنی اس پس و پیش میں تھی آیا فریق مخالف سے جنگ و جدال جائز ہے یا نہیں۔ اس شک کا آغاز اگرچہ امیر المومنینؑ کے دور سے ہی ہو گیا تھا تاہم وقت گزرنے کے ساتھ یہ شک پختہ ہوتا گیا اور دور امام حسنؑ تک اپنی انتہا کو پہنچا یعنی حقیقی معنوں میں شک کے مرحلے میں داخل ہوا۔ حالت ایسی ہو گئی تھی کہ اس شک کی بیماری کا علاج قربانی سے بھی ممکن نہ تھا۔

جب امام حسینؑ نے قیادت سنبھالی تو امت ایک اور نئے مرض میں مبتلا تھی جو کہ ارادہ کا فقدان تھا۔ خط واضح تھا، امام حسینؑ کا موقف واضح تھا

لیکن امت کا ارادہ اس موقف کا ساتھ نہیں دے رہا تھا۔ وہ امت جو کل تک شک و تردد میں مبتلا تھی، حضرت علیؑ اور امام حسنؑ کے ادوار گزرنے کے بعد اب اس کے سامنے راستہ واضح ہو گیا تھا۔ لیکن امت ارادہ کھو چکی تھی، انکے ضمیر مردہ ہو چکے تھے۔ جن لوگوں نے ان کا حق غصب کیا تھا ان کی عزت کو مباح قرار دیا تھا وہی ان کو غافل کرنے میں کامیاب ہو گئے، ان کے ارادوں کو بدل دیا نیز ان سے مقابلہ کرنے کی قوت چھین لی۔ یہ وہ دوسری بیماری ہے جس کا علاج امام حسینؑ نے کرنا چاہا۔

اُس وقت امام حسینؑ کیلئے درج ذیل مفروضات میں سے کسی ایک پر عمل ممکن تھا

۱۔ یزید کی طلب بیعت پر آپؑ اسکی بیعت کر لیتے جس طرح آپؑ کے پدر بزرگوار حضرت علیؑ نے تینوں خلفاء کی بیعت کی تھی۔

۲۔ یزید کی بیعت کو مسترد کرتے اور مدینہ یا مکہ میں ہی قیام کرتے۔

۳۔ اسلامی شہروں میں سے کسی شہر میں پناہ لیتے جیسا کہ آپؑ کے بھائی محمد حنفیہؒ نے تجویز پیش کی تھی۔

۴۔ آپؑ حرکت میں آتے، کوفہ والوں کی دعوت قبول کرتے، کوفہ جاتے اور انجام کار کیلئے آمادہ رہتے۔

اس وقت کے حالات کے پیش نظر چوتھا مفروضہ ہی امامؑ کیلئے قابل قبول ہو سکتا تھا کیونکہ امت اس وقت درج ذیل حالات میں مبتلا تھی:

۱۔ اکثریت اپنی قوت ارادی معاویہ کے دور حکومت میں کھو چکی تھی، مقابلہ کرنے کی طاقت و قدرت ختم ہو گئی تھی۔ عزلت و ذلت ان پر حاوی تھے۔ امت ایک عظیم نقصان سے دوچار تھی۔ خلافت اسلامی ملوکیت قیصر و

کسریٰ میں داخل ہو رہی تھی۔

۲۔ امت کے نزدیک اسلام کی اہمیت بہت کم رہ گئی تھی، شخصی مصلحت کو زیادہ اہمیت دی جا رہی تھی۔ اپنی مصلحت 'اپنا وجود' اسلام سے زیادہ عزیز تھا۔

۳۔ وہ اتنے غافل اور بے حس ہو چکے تھے کہ بنو امیہ کی مختصر سی سازش کامیاب ہو سکتی تھی۔

اس وقت کے صحابہ بھی خلافت کو ملوکیت میں تبدیل ہوتا ہوا دیکھ رہے تھے مگر خاموش تھے جس طرح بعدِ وفاتِ پیغمبرؐ انہوں نے خلافت کے مسئلہ پر خاموشی اختیار کی تھی۔ پہلے مرحلہ میں تو شاید اس لئے خاموشی اختیار کی ہو کہ اس وقت خلافت تو اپنی جگہ باقی تھی صرف خلیفہ تبدیل ہوا تھا جبکہ عہد معاویہ میں خود خلافت میں ایک واضح تغیر پیدا کیا گیا تھا۔ اب خلافت قیصر و کسریٰ کے خطرناک مفہوم میں داخل ہو گئی تھی، محض شرعی لبادہ اُڑھا رکھا تھا۔ صحابہ خاموش تھے۔ معاویہ ان کو دھوکا دے رہا تھا اور لوگ صحابہ کی اس خاموشی کو اپنے لئے جواز بنا لیتے تھے۔

۴۔ ان حالات میں امام حسنؑ کیلئے معاویہ سے مصالحت کرنے کے علاوہ کوئی اور راستہ نہیں تھا۔ چنانچہ اپنی حیثیت و حالت کو سامنے رکھتے ہوئے آپؑ کو یہی اختیار کرنی پڑی کیونکہ آپؑ امت کے امین تھے و سارے حالات سے واقف تھے۔ اگر نہیں جانتے تھے تو صرف عراقی عوام اور جو عراق سے باہر تھے وہ درک نہیں کر رہے تھے جیسے خراسان والے کیونکہ وہ اس امتحان سے نہیں گزرے تھے 'اس آگ میں نہیں جلے تھے جس میں امام حسنؑ جل رہے تھے۔ ان تک صرف خبریں پہنچتی تھیں۔ امام حسنؑ نے جو تنزلی اختیار کی تھی آیا وہ اموی حکومت کو قبول کر کے کی تھی یا مجبوری کے تحت 'اہل خراسان یہ تمیز

نہیں کر پارہے تھے۔

یہ ہے ان حالات کی ہلکی سی جھلک جن کے تحت امام حسینؑ کیلئے ضروری ہو گیا تھا کہ آپؑ ایک ایسا موقف اختیار کرتے جس کے ذریعہ ان چاروں گروہوں کا معالجہ کر سکتے۔ یہ تقسیم کوئی نہائی اور آخری نہیں ہے بلکہ اسکی بھی چار قسمیں ہیں، ممکن ہے ان میں سے ہر ایک پر چند عناوین صادق آتے ہوں۔ لہٰذا اب ضروری ہو گیا تھا کہ امام حسینؑ اس موقف کو اختیار کرلیں جو قسم اول سے مربوط ہے۔ یعنی لوگ ظالم سے مقابلہ کرنے کی قوت کھو چکے تھے' ذلت و خواری کو اپنا شعار بنائے ہوئے تھے۔ بنوامیہ نے لالچ' کے زور پر یہ حالات پیدا کئے تھے۔

دوسرا موقف یہ دیکھنا تھا کہ دین سے متعلق لوگوں کا کیا ایمان ہے' ان کی نظر میں اسلام کی کتنی اہمیت ہے۔ معاویہ نے خلافت کو ملوکیت میں تبدیل کرنے کی جو منطق کو اپنائی تھی اس کو سلب کرنا' اس کے ہاتھ سے اس دلیل کو چھین لینا صرف اس صورت میں ممکن ہو سکتا تھا کہ اس وقت کے صحابہ معاویہ کے مقابلے میں کھڑے ہو جاتے۔ امام حسینؑ نے اس موقف کو اپنا کر واضح کیا کہ صلح امامؑ کی کیا وجوہات تھیں خلافت کا قیصر و کسریٰ کی ملوکیت میں تبدیل ہونا امام حسنؑ کی طرف سے امضاء نہیں تھا۔

اس وقت امت تین قسم کے حالات سے دوچار تھی۔ امام حسینؑ کو ان میں سے ایک موقف کو اختیار کرنا تھا:

۱۔ یزید کی بیعت کر لیتے جس طرح امیر المومنینؑ نے بقائے اسلام کی خاطر بحالت مجبوری تینوں خلفاء کی بیعت کی تھی۔ لیکن ایسا کرنے سے امت کو لاحق کسی بیماری کا علاج نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ یزید کا مسئلہ حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ و عثمانؓ کی خلافت سے مختلف تھا۔ وہاں صرف خلیفہ کا نام بدل گیا تھا' خلافت کا مفہوم اپنی

جگہ باقی تھا۔ لیکن یہاں مفہوم خلافت کو ہی بدل دیا گیا تھا۔ چنانچہ ممکن ہی نہیں تھا کہ اس حالت کو یونہی گزرنے دیا جائے۔ اس کے مقابلے میں اہل بیتؑ جو ہمیشہ سے صحیح معنوں میں اسلام کے قائل رہے ہیں۔ ممکن نہیں تھا کہ وہ مزاحمت نہ کرتے اور اس سلسلہ میں اپنی ذمہ داری پوری نہ کرتے۔

۲۔ بیعت کو رد کرتے ہوئے مدینہ و مکہ میں قیام کرتے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ امامؑ چاہتے تھے کہ مفہوم خلافت کو تبدیل ہونے سے بچائیں۔ حالات امام حسینؑ کے سامنے تھے اور امامؑ ان سب کا مشاہدہ کر رہے تھے۔ چنانچہ اگر آپؑ مدینہ و مکہ میں قیام کرتے اور بیعت کو وہیں مسترد کرتے تو آپؑ بنوامیہ کے ہاتھوں قتل ہو جاتے اگرچہ استار کعبہ سے تکیہ کر کے کیوں نہ بیٹھتے۔ اور اس طرح سے قتل ہونا سودمند نہ ہوتا' لوگوں کے مردہ ضمیر بیدار نہیں ہوتے۔ لہٰذا آپؑ نے یہ کام کربلا میں شہید ہو کے کیا۔

لوگوں کو اپنے بنیادی عقیدے کی طرف پھیرنا' لوگوں میں باقی عواطف و شعور کو بیدار کرنا' ان میں جان ڈالنا' ممکن نہیں تھا کہ آسانی سے کامیاب ہو جاتے۔ لہٰذا ضروری تھا کہ ہر اس چیز کو جو عاطفہ کو زندہ کرنے میں فعال ہو اختیار کرتے۔ مکہ و مدینہ میں قتل ہونا اس مقصد کو پورا نہیں کرتا تھا۔

۳۔ تیسرا مفروضہ یہ تھا کہ آپؑ کسی اور ملک میں پناہ لے لیتے یہ تجویز گرچہ ایک مختصر مدت کیلئے صحیح تھی۔ ممکن تھا کہ امامؑ یمن وغیرہ سے کچھ اپنے شیعوں کو جمع کرنے میں کامیاب ہو جاتے لیکن بہت جلد آپؑ پھر تنہا ہو جاتے۔ حوادث کے ایسے گرداب میں پھنس جاتے جس سے بچنا لازمی تھا۔ ضروری تھا کہ امام حسینؑ اپنے فریضہ کو جہاں واقعہ پیش آ رہا تھا وہیں انجام دیتے یعنی شام' عراق اور مکہ و مدینہ انہی مقامات پر ہی آپؑ کی تبلیغ موثر ہو سکتی تھی۔

شام مرکز خلافت تھا۔ کوفہ والوں میں جنبش ہے۔ مدینہ ومکہ مرکز اسلام ہیں۔ لہٰذا امامؑ کیلئے ضروری تھا کہ چوتھے موقف کو اختیار کریں اور امت کے ضمیر کو زندہ کریں، لوگوں کو یہ باور کرائیں کہ دین اسلام کتنی اہمیت کا حامل ہے۔ خلافت کو ملوکیت میں تبدیل کرنے کے عمل کو مسترد کر کے تمام مسلمانوں پر یہ واضح کریں کہ امام حسنؑ کی خلافت سے تنزلی اصلاً اِمضاء نہیں تھا بلکہ یہ قیام امام حسینؑ کا مقدمہ تھا۔

امت میں فقدان ارادہ

اب ہم جاننا چاہیں گے کہ امت کو لاحق فقدانِ ارادہ کا مرض انکے جسم میں کہاں تک سرائیت کر چکا تھا تاکہ ہم یہ اندازہ کر سکیں کہ اس بیماری کی گہرائی کس حد تک تھی کیونکہ مرض کی تشخیص کے بعد ہی علاج کے بارے میں سوچا جا سکتا ہے۔ اگر اندازہ وہی ہے جو ہم پہلے سمجھ چکے ہیں یعنی اس وقت جو حالات پیدا ہو چکے تھے تو ان کا علاج صرف اور صرف قربانی تھی۔ لہٰذا قربانی بھی اتنی عمیق و گہری ہونی چاہئے جتنی شدید گہرائی میں وہ بیماری ہے یا وہ حالات اتنا سنگین رخ اختیار کر چکے ہیں کہ بیماری اور دوا میں ون ٹو ون مقابلہ کرنا ہوگا۔ اگر مرض کی شدت کی بہ نسبت دوا کم قوت کی ہو یا اس کی خوراک کی مقدار کم ہو تو بیماری ٹھیک نہیں ہو گی۔

یہ بیماری پوری امت کے تمام گروہوں کو لاحق ہو چکی تھی۔ سوائے اِدھر اُدھر کے چند افراد کے سب اس وبا کا شکار ہو چکے تھے۔ بس وہ لوگ جو امام حسینؑ سے مل گئے تھے محفوظ تھے۔

امت میں فقدان ارادہ کے مرض کی شمولیت کے نمونے :

پہلا نمونہ : عقلاء وبرجستہ شخصیات موت سے ڈرتے تھے : اگر ہم امامؑ کی حرکت و قیام کے دورانیہ پر غور کریں تو ہم دیکھتے ہیں کہ امام حسینؑ نے جب مدینہ

سے مکہ جانے کا ارادہ کیا یا مکہ چھوڑ کر عازم عراق ہوئے تاکہ وہاں جا کر اپنی شرعی مسئولیت کو نبھائیں اور بنو امیہ کے طاغوت کے خلاف کھڑے ہو جائیں' تو ہر جگہ سے عقلاء کی طرف سے یہی نصیحتیں آرہی تھیں کہ تعقل کو تہور پر ترجیح دینا چاہئے یعنی یہ تمام حضرات کود پڑنے پر سوچنے کو ترجیح دے رہے تھے۔ یہ سارے عقلاء تھے جو اس بات پر متفق تھے کہ امامؑ کا یہ عمل طبیعی نہیں ہے۔ یہ لوگ امامؑ کو موت سے ڈرا رہے تھے۔ یہ لوگ کہتے تھے کہ آپؑ کیسے بنو امیہ کے خلاف قیام کریں گے۔ ان کے ہاتھ میں سلطنت ہے' افرادی قوت ہے' لوگوں کو دھوکہ دینے' ڈرانے' دھمکانے کی تمام طاقت ان کے ہاتھ میں ہے۔ وہ لوگ امام حسینؑ کو اس قیام کے انجام سے آگاہ کر رہے تھے جس کو امامؑ آخر میں پہنچے۔ اس طرح سے اس وقت کے عقلاء امام حسینؑ کو سلامتی اپنانے کی تلقین کر رہے تھے اور یہ نہیں سمجھ رہے تھے کہ ممکن ہے قربانی' حیات کا نعم البدل ہو اگرچہ نفس کتنا ہی قیمتی کیوں نہ ہو۔ خود کو بچانے کی زندگی سے قربانی بہتر ہے۔ یہ نصیحتیں امامؑ کو عام لوگوں کی طرف سے نہیں مل رہی تھیں بلکہ یہ سب اُس وقت کی سربرآوردہ شخصیات تھیں جن کے ہاتھوں میں زمانے کے حل و عقد تھے۔ جیسے عبداللہ بن عباس' عبداللہ بن عمر' آپؑ کے ابن عم عبداللہ بن جعفر' آپؑ کے بھائی محمد بن حنفیہ۔

عبداللہ بن جعفر کا آپ سے نسبی رشتہ بھی تھا لیکن نفسیاتی طور پر کمزور تھے۔ لہٰذا جب ان کو خبر ملی کہ آپؑ مکہ سے جلدی روانہ ہو رہے ہیں تو آپؑ کو ایک خط میں لکھا تھا کہ آپؑ میرے آنے تک انتظار کریں۔ لیکن امام حسینؑ نے ان کا انتظار نہیں کیا۔ جب عبداللہ بن جعفر مکہ پہنچے تو آپؑ مکہ سے نکل چکے تھے۔ انہوں نے والیٔ مکہ سے فوراً آپؑ کے نام امان نامہ لیا اور امامؑ تک پہنچے۔ وہ چاہتے تھے کہ اس امان نامہ کے ذریعہ امامؑ کو مکہ چھوڑ کر جانے کے تمام ارادے ترک کرنے پر آمادہ

کر سکیں۔ کیونکہ امامؑ بنو امیہ کے خوف سے مکہ چھوڑ رہے ہیں اور امان نامہ ملنے کے بعد مکہ چھوڑنے کا جواز نہیں رہے گا۔

یہ وہ نصائح ہیں جو اس وقت امت کی پستی میں ہونے کی دلیل تھی۔ اس وقت کے رؤساء سب کے سب اس پستی میں گرفتار تھے۔ عام لوگ تو اس سے بھی کئی گنا زیادہ دنیاوی خواہشات میں گھرے ہوئے تھے۔ امام حسینؑ کو امت کے اس قسم کے ضمیر کا سامنا تھا یا یوں کہیں کہ امامؑ کی تحریک کو ایسے لوگوں کا سامنا تھا۔ دوسرے عوامل بھی اپنی جگہ موجود تھے۔ یہ جمود' یہ سکوت' اس وقت ایک ایسی سخاوت کے منتظر تھے جو اس پستی کا بدل ہو۔

دوسرا نمونہ : عبداللہ بن حر جعفی کا مؤقف ہے : امام حسینؑ خود بہ نفس نفیس اس سے ملے تھے اور نصرت کی اپیل کی تھی۔ وہ آپؑ کو حق بجانب سمجھتا تھا' مگر اس کیلئے یہ گراں تھا کہ اس کا خون اس راہ میں بہے۔ سوائے گھوڑے کے کچھ اور دینے کیلئے تیار نہیں تھا۔ وہ قربانی کے اس ذائقہ کو چکھنا نہیں چاہتا تھا۔

تیسرا نمونہ : رؤساء بصرہ کا مؤقف ہے : امام حسینؑ نے بصرہ کے چھ بزرگوں کے نام خط لکھا۔ یہ وہ لوگ تھے جو دورِ خلافت امیر المومنینؑ میں آپؑ کے ساتھ تھے۔ بصرہ کے زعماء و بزرگان دو گروہوں میں تقسیم تھے ایک گروہ حضرت امیر المومنینؑ کا حامی تھا اور ایک گروہ جناب عائشہؓ طلحہ اور زبیر کا حامی تھا۔ امام حسینؑ نے ان چھ افراد کو جو حضرت علیؑ سے مرتبط تھے انتخاب کیا۔ آپؑ جانتے تھے کہ یہ لوگ اہل بیتؑ سے ولایت رکھنے والے تھے 'شعار اہل بیتؑ سے اتفاق کرنے والے تھے۔ لہٰذا ان سے آپؑ نے مدد و نصرت طلب کی'۔ اپنی فریاد کو ان تک پہنچایا۔ انہیں اس خطرہ سے آگاہ کیا جو امت اسلامی کو لاحق تھا۔ یہ خطرہ یزید ابن معاویہ کی قیصر و کسریٰ جیسی حکومت کی صورت میں تھا۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ ان کا کیا رد عمل سامنے آتا ہے۔ ان میں سے ایک شخص عبداللہ بن مسعود نھشلی ہیں۔ انہوں نے دعوت کو قبول کیا اور جواب دیا ان کے علاوہ باقی سب نے خیانت کی۔ انہی میں سے ایک شخص (منذر بن جارود) نے امام حسینؑ کے سفیر کو مع خط کے عبیداللہ بن زیاد کے حوالے کر دیا۔ یہ لوگ شیعہ تھے۔ عثمانی نہیں، علوی تھے۔ لیکن ان میں علویت کا مفہوم ختم ہو چکا تھا۔ تمام ارادے فوت ہو چکے تھے۔ ایسا کرنا عبیداللہ بن زیاد کی محبت میں نہیں تھا، یہ لوگ اس کے حامی نہیں تھے، اس کو حق پر نہیں سمجھتے تھے بلکہ خود کو بچانے کیلئے ایسا کیا تھا، اس ڈر سے کیا تھا کہ کہیں ابن زیاد کو پتہ نہ چلے کہ حسینؑ ابن علیؑ نے ان سے مدد و نصرت طلب کی ہے۔ یہ ان کی کمزوری کی علامت تھی۔ حاکم کو پتہ نہیں چلا تھا۔ ضرورت نہیں تھی کہ ان کے سامنے پیش کرتے لیکن صرف یہ چاہتے تھے کہ معمولی سا خفیف بوجھ بھی نہ اُٹھائیں۔ خود کو ہر طرح سے بچانا چاہتے تھے، کم سے کم احتمالات سے بچنے اور اپنے لئے سلامتی کی پوری ضمانت لینے کیلئے قاصد حسینؑ اور خط دونوں کو حاکم کے حوالے کر دیا۔ عبیداللہ کے حکم سے حسینؑ کا یہ قاصد شہید ہو گیا۔

ایک اور شخص احنف بن قیس جو حضرت علیؑ کے ساتھ ہوتے تھے۔ انہوں نے علیؑ کو قریب سے دیکھا تھا آپؑ کے محضر مبارک میں تربیت پائی تھی۔ انہوں نے امام حسینؑ کو خط لکھا: آپؑ صبر کریں جلد بازی نہ کریں۔ اس جواب میں یہ جملہ بھی تھا: "ولا یستخفنك الذین لایومنون" یعنی جس چیز پر یقین نہ ہو اس کو ہلکا نہ سمجھیں۔ یہ خط قیام امامؑ کے خلاف ایک اعراض تھا۔ یہ تھے اس وقت کے شیعوں سے ملنے والے جوابات۔

احنف بن قیس کا خط اس وقت کی امت کے شکستہ اخلاق کی ترجمانی کرتا ہے۔ امت کس حالت میں مبتلا تھی! معلوم ہوتا ہے کہ وہ ارادے کھو چکے تھے، اپنے

وجود کا احساس نہیں رکھتے تھے یا کم از کم ان کے اندر ایک ایسی شکستگی نمو پا رہی تھی جسے ان کے ہاتھوں سے تقویت مل رہی تھی۔ یہ لوگ جو امت کو ان کی اپنی حالت پر باقی رکھنا چاہتے تھے اور اسی کو طاقت و وسعت دے رہے تھے۔ کسی قسم کی شجاعت کو تہور سمجھتے تھے 'امور مسلمین پر سوچنے کو استعجال' عجلت پسندی سمجھتے تھے۔ اسلام و مسلمین جن مسائل میں مبتلا تھے ان کے حل سے متعلق اہتمام کرنے کو ہلکا پن سمجھتے تھے۔ غیر عقلی و عجلت پسندی سے تعبیر کرتے تھے۔ ان کے شکستہ اخلاق اس وقت کی امت سے آشکار تھے۔ وہ اپنی اس شکستگی' زبوں حالی' پسماندگی اور زمین گیری کے جواز میں کہتے تھے: اب مقابلہ کا دور ختم ہو چکا ہے۔ پہلے والے مفاہیم بدل رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں نئے اقدار نئے اہداف اس کی جگہ لے رہے ہیں۔ نئے نئے دلائل پیش کر رہے تھے۔ امامؑ اس اخلاق کا خاتمہ چاہتے تھے تاکہ نئے اخلاق پیدا کئے جائیں ایسے اخلاق جن میں قدرت و حرکت اور جدیّت ہو۔ یہاں امامؑ فرماتے ہیں ''میں موت کو سعادت کے علاوہ کچھ نہیں سمجھتا اور ظالمین کے ساتھ زندگی کو ذلت سمجھتا ہوں''۔ آپؑ امت کے موجودہ اخلاق کو نئے سرے سے بدلنا چاہتے تھے۔ اخنف بن قیس جیسے لوگوں کے اندر وہ اخلاق ختم ہو چکا تھا اور اس کے ساتھ چلنے والے لوگوں کی بھی یہی حالت تھی۔

چوتھا نمونہ: قبیلہ بنو اسد کا اپنا گاؤں چھوڑ کر جانا ہے: جب حبیب ابن مظاہر نے امام عالی مقامؑ سے اجازت طلب کی کہ وہ اپنے قبیلہ والوں کو نصرت کی دعوت دیں۔ اس وقت کے لوگ جانتے تھے کہ حبیب کون ہیں؟ ان کی جہادی خدمات 'درخشندہ تاریخ' صفائے سیرت اور ورع و تقویٰ سب جانتے تھے۔ لیکن جب انہوں نے دعوت دی تو یہ نتیجہ سامنے آیا کہ قبیلہ والے اسی رات جگہ چھوڑ کر چلے گئے۔ حبیب ابن مظاہر واپس آگئے اور امام حسینؑ کو خبر دی کہ قبیلہ والے

چاہتے ہیں کہ غیر جانبدار رہیں۔ وہ سمجھ رہے ہیں کہ ہم کافی نہیں ہیں کہ لشکر عمر سعد سے مقابلہ کریں۔ امامؑ نے جواب میں فرمایا: "**لاحول ولا قوۃ الاباللہ العلی العظیم**"۔ یہ امت کی وہ بیماری تھی جس کا امامؑ علاج کرنا چاہتے تھے۔

پانچواں نمونہ: **بعد از شہادتِ امامؑ اہل کوفہ کا مؤقف ہے:** قیس بن مسہر صیداوی کے بارے میں نقل کرتے ہیں جنھیں امام حسینؑ نے اپنا خط دے کر اہل کوفہ کے پاس بھیجا تھا کہ جب وہ کوفہ میں داخل ہوتے ہیں' اہل کوفہ اس وقت منقلب ہو چکے تھے۔ راستے بند تھے عبید اللہ ابن زیاد مسلط ہو چکا تھا۔ چنانچہ امامؑ کے یہ قاصد گرفتار ہوئے' عبید اللہ کے پاس حاضر کئے گئے۔ انہوں نے دربار میں پہنچنے سے پہلے ہی امامؑ کا خط پھاڑ دیا۔ عبید اللہ کے دربار میں پہنچ کر ان سے سوال ہوا خط کو کیوں پھاڑ دیا۔ جواب دیا میں نہیں چاہتا تھا کہ تم اس خط کے مضمون سے آگاہ ہو جاؤ۔ سوال کیا کہ اس خط میں کیا لکھا ہوا تھا۔ انہوں نے کہا: اگر تم کو یہ بتانا ہوتا تو میں خط کو ہی نہ پھاڑتا۔ عبید اللہ نے کہا: منبر پر جاؤ اور علیؑ حسنؑ اور حسینؑ پر سبّ کرو۔ انہوں نے اس موقع کو غنیمت جانا اور منبر پر گئے۔ ان خطرناک حالات میں اپنی زندگی کے آخری لمحات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے نہایت شجاعت وجوانمردی کے ساتھ کھڑے ہو گئے۔ جلاّدوں کے سامنے اہل کوفہ کی طرف رخ کر کے اپنا پیغام سنایا۔ انہوں نے کہا میں حسینؑ کا نمائندہ ہوں آپؑ کوفہ تشریف لا رہے ہیں۔ اس طرح سے انہوں نے منبر سے بے اعتنائی کے ساتھ بات کی اپنے پیغام کو پہنچایا۔ ادھر سے حکم ہوا کہ انہیں قتل کر دیا جائے۔ اس طرح آپ نے اپنے ہدف کے حصول میں اپنا خون دے دیا۔ جو شخص ان کا سر تن سے جدا کر رہا تھا اس سے کسی نے پوچھا کیوں قتل کرتے ہو' اس نے کہا میں چاہتا ہوں کہ اس کو راحت کی نیند سلا دوں۔ یہ وہ امت تھی جس کے افراد صرف اپنی

ذاتی زندگی سے وابستہ تھے لیکن کُل انسان کے وجود سے بے خبر تھے' سوچتے نہیں تھے اپنے عقیدہ کا خیال نہیں تھا کہ ایسا کرنا ان کیلئے مہنگا پڑ رہا تھا۔ اس وجہ سے مقتول کے سر کی پرواہ نہ تھی۔ وہ عبیداللہ بن زیاد کے سائے میں انہیں راحت دلا رہا تھا۔ یہ سکوت' یہ جمود امت کی فکری طور پر پستی کا پتہ دے رہے تھے۔

چھٹا نمونہ : حکومت کی طرف جھکاؤ یا حکومت کا لوگوں پر دباؤ ہے :

حکومت کی طرف ایک ایسا گرم تیز رجحان پایا جاتا تھا کہ عبیداللہ بن زیاد نے دو یا تین ہفتہ کے اندر (قتل مسلمؑ کے بعد سے لیکر محرم تک کے دوران) میں اسی شہر کوفہ سے ہزاروں کی تعداد میں لشکر کو آمادہ کیا۔ یہ اہل لشکر وہی لوگ تھے جو حضرت علیؑ کے ساتھ ہوتے تھے' ولایتِ علی رکھنے والے' صفین میں علیؑ کے ساتھ تھے۔ اسی طرح دیگر جنگوں' نہروان و جمل میں بھی علیؑ کے ساتھ تھے' ان میں سے سر فہرست عمرو ابن حجاج زبیدی تھا۔ یہ وہ شخص تھا جس نے علیؑ کے ساتھ مصیبتیں جھیلی تھیں۔ زیاد ابن ابیہ کے سخت دور کو دیکھا تھا۔ لیکن اپنے ایمان میں استقامت نہیں دکھا سکا۔ اپنی آخری عمر سے پہلے ہی عقیدے کو طلاق دیدیا کیونکہ وہ دیکھ رہا تھا کہ اگر اس عقیدہ پر قائم رہا تو سودا بہت مہنگا پڑے گا جبکہ اس کے چھوڑنے پر اس کے بدلے میں کھلی دنیا مل رہی تھی۔ لہٰذا علیؑ کے ساتھ جہاد کرنے والا یہ شخص شکست کھا گیا۔ ایک مسلمان کی حیثیت سے جو شخصیت اس میں باقی تھی وہ بھی ختم ہو گئی۔ یہ وہ شخص ہے جس نے عمر سعد کو حسینؑ اور اہل بیتؑ رسول پر پانی بند کرنے کا بدترین مشورہ دیا' گھاٹ پر پہرے بٹھا دیئے گئے۔

اسی ظالم حکومت کو شبث بن ربعی نے بھی قبول کیا۔ یہ بھی جنگ صفین میں علیؑ کے ساتھ تھا۔ صفین میں وہ جانتا تھا کہ علیؑ پیغمبر اکرمؐ کی نیابت میں جنگ لڑ رہے ہیں جسطرح خود پیغمبرؐ نے غزوہ بدر میں لشکر کی قیادت کی تھی۔ لیکن یہاں

دنیوی خواہشات نے اس کا گلا گھونٹ دیا اور دنیا میں حل ہو گیا تھا۔ وہ اس حد تک غرق ہو چکا تھا کہ جب عبید اللہ بن زیاد نے اس کے پاس آدمی بھیجا کہ اسے جنگ کیلئے آمادہ کرے تو اس نے بیماری کا عذر پیش کیا۔ اس کے علاوہ اس کے پاس کوئی اور عذر نہیں تھا۔ اس نے یہ نہیں کہا کہ میں وقت کے امامؑ سے جنگ نہیں کر سکتا۔ صرف اتنا کہا کہ میں مریض ہوں۔ عبید اللہ نے دوبارہ آدمی بھیجا اور کہلا بھیجا کہ اس سے کہہ دو مسئلہ انتہائی حساس ہے' بیماری کو چھوڑ دو یہ اعلان کرو کہ ہمارے ساتھ ہو یا ہمارے دشمنوں کے ساتھ۔ واضح جواب چاہیے۔ اس نے جو نہی یہ سنا اور معلوم ہوا کہ مسئلہ اہم ہے فوراً اپنی جگہ سے اٹھا اور لباس پہن کر عبید اللہ بن زیاد کے پاس آیا اور لبیک کہا۔ اس قسم کا منفی رویّہ اس وقت کے لوگوں پر طاری بیماری کی واضح و روشن دلیل تھی۔

ساتواں نمونہ : جناب **مسلم بن عقیلؑ اور ہانی کا آزمائشی مرحلہ تھا**: یہ دور حضرت مسلمؑ اور جناب ہانیؒ بن عروہ کا امتحانی دور تھا جس کی دنیا میں کوئی نظیر نہیں ملتی۔ یہ ایسا دور ہے جس سے اس مرض کا بخوبی تصور کیا جا سکتا ہے۔ یہ اس کی بہت واضح اور روشن دلیل ہے کہ فقدان ارادہ کا مرض کس حد تک پھیل چکا تھا۔ یہ بدترین دور گزرا ہے۔ انسان کبھی سوچتا ہے کہ مسلم کے ساتھ یہ کیسا اتفاق ہوا کہ تمام تر طاقت و قدرت حاصل کرنے کے بعد بہ یک لحظ ہاتھ سے نکل گئی۔ اتنی عوامی تائید کیسے ختم ہو گئی۔ مسلم کیسے تنہا رہ گئے۔ کیسے کوفہ کی گلیوں میں تردّد کے شکار ہوئے۔ کیوں اس افرادی قوت سے عبید اللہ بن زیاد کے ساتھ مقابلہ نہیں کیا؟ شہید صدرؒ فرماتے ہیں یہ طاقت نہیں تھی' یہ قدرت نہیں تھی' یہ صرف رجسٹر میں درج نام تھے۔ یہ اٹھارہ ہزار یا بیس ہزار یا تیس ہزار محض شوشے تھے۔ یہ عوام کے جلسے جلوس کی طرح تھے۔ امت مردہ ہو چکی تھی یہ اسی مردہ امت کی تعداد

تھی۔ یہ وہی امت تھی جو انتہائی عجیب حالات میں مبتلا تھی۔ نفسانی طور پر شکستہ تھی۔ وجدان گرا ہوا تھا۔ ضمیر مردہ ہو چکا تھا۔ جو کچھ پہلے کیا تھا اس کا انجام یہ ہوا۔

عبید اللہ بن زیاد نے ہانی بن عروہ کی طرف ایک شخص سے کہلا بھیجا کہ امراء زیادتی کو برداشت نہیں کرتے۔ امیر کی زیارت کو نہیں آئے کیوں امیر سے نہیں مل رہے ہو۔ یہ پیغام اس وقت ہانی کو پہنچا جب انہوں نے مسلم ابن عقیلؑ کو اپنے گھر میں پناہ دیا تھا۔ شیعہ چھپ چھپ کر آپؑ سے ملتے تھے۔ غرض ہانی کو عبید اللہ بن زیاد کے دربار میں لایا گیا۔ عبید اللہ نے ہانی کو متہم کیا اور کہا تم نے مسلم کو اپنے ہاں پناہ دے رکھا ہے۔ تم ہمارے خلاف قیام کرنے کا ارادہ رکھتے ہو؟ ہانی نے کہا مجھے پتہ نہیں کہ مسلم کہاں ہیں۔ عبید اللہ نے کہا ہم مسلم کو ضرور پائیں گے۔ ہانی نے کہا اگر مسلم میرے قدموں کے نیچے ہوں تو میں قدم نہیں اٹھاؤں گا۔ ہانی کا شمار ان چند افراد میں سے تھا جو یہ استطاعت رکھتے تھے کہ قیام امام حسینؑ کی ماہیت کو اس مردہ امت کیلئے کشف کریں۔ ہانی نے عبید اللہ سے تمام تر نصیحتیں کیں اس سے کہا میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں کہ تم اور تمہارا خاندان یہاں سے چلا جائے۔ ہم تمہیں پکڑیں گے نہیں۔ ہانی اس طرح بات کرتے تھے جیسے ان کے پیچھے ایک افرادی قوت ہے۔ جو ان کے ارادوں کی پاسداری کیلئے بیٹھے ہیں۔ جب عبید اللہ نے غضبناک ہو کر انہیں حبس کرنے کا حکم دیا اور یہ خبر پھیلی کہ ہانی قتل ہو گئے ہیں۔ تو عمرو ابن حجاج چار ہزار لشکر لے کر آیا اور ہانی کی خبر گیری کی دارالامارہ کے باہر دھرنا دیا اور ہانی کی حیات کا مطالبہ کیا۔ عبید اللہ بن زیاد نے قاضی شریح کو بھیجا چونکہ قاضی شریح میں گواہ بننے کے شرائط موجود تھے۔

عبید اللہ نے کہا: قاضی جاؤ جس کمرے میں ہانی کو رکھا ہوا ہے دیکھو اور باہر جمع لوگوں سے کہہ دو وہ زندہ ہے۔ شریح قاضی لعنۃ اللہ علیہ کہتا ہے کہ جونہی میں

کمرے میں داخل ہوا اور ہانی کو دیکھا تو اس نے مجھ کو دیکھ کر چیخ ماری اور کہا : کہاں ہے وہ مسلمان جو مجھے بچائے ؟ اگر دس آدمی بھی محل میں داخل ہو جاتے تو ہانی کو نجات دلا سکتے تھے کیونکہ اندر کوئی پولیس کوئی سپاہی نہیں تھا۔ اگر دس آدمی آمادہ ہو جاتے تو کوفہ کا رخ بدل جاتا۔ لیکن وہ جو تصور کر رہے تھے کہ اندر پولیس یا لشکر ہے محض ایک وہم تھا۔ ان کے ارادے ختم ہو چکے تھے ۔ یہ امت تھی جو اپنی شخصیت کو کھو چکی تھی۔ وہ یہ سوچ کر آئے تھے کہ یہ قصر مرکزِ طاقت ہے یہاں سے گزرنا ناممکن ہے۔ حقیقت میں یہ قصر اندر سے خالی تھا' نہ مقابلہ کیلئے اسلحہ تھا نہ اتنے افراد تھے کہ دس آدمیوں سے مقابلہ کر سکتے۔ لہٰذا ہانی نے کہا یہ مسلمان کہاں گئے ہیں۔ اس حکومت کو نابود کرنے کیلئے دس آدمی کافی تھے' دس آدمی آرام سے قبضہ کر سکتے تھے۔

شریح قاضی کہتا ہے کہ میں عمر ابن حجاج کی طرف گیا اور اس سے کہا ہانی زندہ ہے تاکہ وہ واپس چلا جائے۔ عمر ابن حجاج اور اسکے ساتھ موجود چار ہزار لشکر کا ہدف صرف یہ تھا کہ ہانی زندہ ہوں۔ ان کو اور کوئی فکر نہیں تھی ورنہ ان کو چھوڑ کر جانے کے بجائے ساتھ لے جاتے۔ یہ رویہّ' یہ بے دلی عدم ارادہ کی کیفیت ظاہر کرتا ہے۔ اس کی فکر نہ کی آخر قید کیوں ہیں۔

قاضی شریح کہتا ہے کہ میں نے چاہا کہ ان لشکر والوں سے کہوں کہ ہانی صرف دس آدمی چاہتا ہے۔ اس خوفناک جگہ پر ایک دھند نظر آرہا تھا جس میں عبیداللہ بن زیاد بیٹھا تھا اگر دس آدمی ہجوم کرتے تو یہ مجسمہ ٹوٹ جاتا۔ شریح کہتا ہے کہ میں نے دیکھا میرے پیچھے عبیداللہ ابن زیاد کے فوجی کھڑے ہیں۔ میں ہانی کی باتیں بتانا چاہتا تھا مگر چپ رہا۔ میں نے صرف رسمی طور پر گواہی دی کہ ہانی زندہ ہے۔ اسی بات پر عمر ابن حجاج واپس چلے گئے اور دوسرے دن ہانی شہید ہو گئے۔

عبیداللہ بن زیاد کے ساتھ تیس سے زیادہ آدمی نہیں تھے ادھر مسلم بن عقیلؑ کے ساتھ چار ہزار کا لشکر تھا۔ لیکن ان کے پاس دل تھے ہاتھ نہیں تھے' ارادہ نہیں تھا۔ ان کے نام کیا پڑھوں جو اس معرکہ میں مسلم کے ساتھ تھے۔ اس چار ہزار لشکر میں بڑی بڑی شخصیات تھیں لیکن یہ سب شکست کھا گئے۔

تحریک حسینی میں تحریک تنہا حسینؑ نے پیدا کی۔ حسینؑ کا ہر قطرہ خونِ گلو تحریک مصطفیٰ تھا۔ یہ ستر آدمی جو امامؑ کے ساتھ شہید ہوئے آزمائشوں کا نچوڑ ہیں۔ ان لوگوں نے کیوں میدان نہیں چھوڑا؟ جبکہ وہ افراد جو مسلم بن عقیل کے ساتھ تھے' تاریخ لکھتی ہے کہ عورتیں آتی تھیں اور اپنے شوہر' باپ' بھائی اور بیٹوں کو لے جاتی تھیں اور یہ کہتی تھیں تمہیں کیا ہو گیا ہے کیوں بادشاہوں کے امور میں مداخلت کرتے ہو۔ یہ ہے فقدانِ ارادہ۔ انسان حل ہو جاتے ہیں۔ عورتوں کی باتوں میں آئے اور واپس گھروں کو چلے گئے۔ انہی عورتوں میں سے بعض عورتیں ایسی بھی ہیں جنہوں نے امام حسینؑ کی شہادت کے بعد ایسے کارنامے انجام دیئے جو تاریخ کے صفحات پر ثبت ہیں۔ انہی عورتوں نے بعد از شہادت امامؑ' عمر بن سعد کی امیر کوفہ بننے کی تمام تر سازشوں کو ناکام بنا دیا۔ جب یزید ابن معاویہ مر گیا۔ عمر سعد نے بنوامیہ کی طرف سے کوفہ میں بیعت کی تحریک چلائی اور خود امیر بننے کی کوشش کی تو یہی خواتین اپنے باپ بیٹوں اور شوہروں کے پاس جا کے انہیں اٹھا کر باہر لائیں۔ جو ان سے کہتی تھیں تمہیں بادشاہوں سے کوئی کام نہیں' انہی عورتوں نے عمر ابن سعد کے خلاف جلوس نکالا اور مظاہرہ کیا۔ امام حسینؑ کا مرثیہ پڑھتی تھیں۔ یہی چیخ و پکار کر کہنے لگیں: "جو حسینؑ کا قاتل ہو وہ کوفہ کا امیر نہیں ہو سکتا"۔ یہاں تک کہ عمر بن سعد مارا گیا۔

آٹھواں نمونہ: **امت کا عمل اور عاطفہ ہم آہنگ نہیں تھے:** شہید صدرؒ

فرماتے ہیں ان ہزیمت کے مظاہر میں تعجب خیز مظہر وہ تناقض تھا جو امت کے دلوں اور عواطف و عمل میں پایا جاتا تھا۔ یہ وہ تناقض تھا جس کا ذکر کرتے ہوئے فرزدق نے امامؑ سے کہا: کوفہ والوں کے دل آپؑ کے ساتھ ہیں اور تلواریں آپؑ کے مخالف ہیں۔ انہوں نے یہ نہیں کہا کہ کچھ لوگوں کے دل آپؑ کے ساتھ ہیں اور کچھ لوگوں کی تلواریں آپؑ کے خلاف کھینچی ہوئی ہیں بلکہ یہ کہا جن لوگوں کے دل آپؑ کے ساتھ ہیں انہی کی تلواریں آپؑ کے خلاف ہیں۔ مذکورہ بالا ان تمام آٹھ قسم کے نمونوں میں تناقض پائے جاتے ہیں۔

لیکن ان تمام تناقضات کے باوجود ان میں کوئی تناقض نہیں پایا جاتا کیونکہ جو اپنے ارادوں کا مالک نہ ہو اسکا ہاتھ خود اپنے ہی عاطفہ کے خلاف حرکت کر سکتا ہے۔ لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ انہوں نے روتے ہوئے امام حسینؑ کو شہید کیا۔ وہ یہ احساس کر رہے تھے کہ ہم اپنی عظمت' شان و شوکت کو قتل کر رہے ہیں' ہم اپنی آخری آرزو کو قتل کر رہے ہیں۔ امامت کے ورثہ کو قتل کر رہے ہیں۔ یہ وہ باقی ماندہ آثار تھے جن سے تمام امت کے باشعور افراد کی امیدیں وابستہ تھیں کہ یہ اسلام کے اندر نئی روح ڈالیں گے۔ یہ لوگ اسی آخری امید کو ذبح کر رہے تھے جو ان پر ڈھائے جانے والے مظالم کو بند کرنے والی تھی۔

وہ شعور رکھتے تھے مگر قدرت نہیں رکھتے تھے۔ لہٰذا انہوں نے روتے ہوئے اپنے امام کو قتل کیا۔ ہم خدا سے دعا کرتے ہیں کہ ہمیں ان لوگوں میں قرار نہ دے اور ہمارا شمار ان لوگوں میں نہ کرتے جو اہداف امام حسینؑ کو قتل کرتے ہوں اور روتے بھی ہوں۔ امام حسینؑ ایک فرد نہیں جس نے ایک عرصہ زندگی کی ہو اور گزر گیا ہو۔ امام حسینؑ کُل اسلام تھے اور ہیں۔ امام حسینؑ کُل اہداف ہیں جس کیلئے آپؑ شہید ہوئے۔ یہی اہداف امام حسینؑ ہیں۔ یہ اہداف روح و فکر حسینؑ

ہیں۔ یہ اہداف 'اہداف عاطفۂ حسینؑ ہیں۔ امام حسینؑ' آپؑ کے اہداف یہ سب وہ اقدار ہیں جو اسلام میں مجسّم ہیں۔

(اہل کوفہ اس امامؑ کو قتل کیئے جا رہے تھے اور روئے جا رہے تھے۔ یہاں ایک خطرناک چیز ہے کہ ہم اس آزمائش کیلئے تمنا کریں کہ نعوذباللہ حسینؑ کو قتل بھی کریں اور روئیں بھی۔ ہمیں ہوش میں آنا چاہئے' سوچنا چاہئے یہ ہم پر واجب ہے کہ ہم کم از کم حسینؑ کے قاتلوں میں سے نہ ہوں ورنہ رونا کسی کام کا نہیں ہے۔ ہم اسلئے نہ روئیں کہ ہم حسینؑ کے قاتل نہیں ہیں' کیونکہ رونا کافی نہیں ہے۔ اس صورت میں عمر سعد قاتل حسینؑ نہیں ٹھہرے گا کیونکہ وہ بھی رویا ہے۔ جس وقت حضرتِ زینبؑ شہداء کے لاشوں کے پاس سے گزر رہی تھیں اور اپنے بھائی کے جسم کو دیکھا تو مدینہ کی طرف متوجہ ہو کر اپنے جد بزرگوارؐ کو آواز دی' اُنؐ کو خبر دی کہ یہ آپؐ کا حسینؑ ہے جو خاک و خون میں غلطاں ہے' یہ آپؐ کے اہل حرم ہیں جو اسیر ہو رہے ہیں۔ یہ منظر دیکھ کر عمر سعد رو دیا اور تمام لشکر بھی رویا۔ یہی لوگ تھے جنہوں نے امامؑ کا خون بہایا تھا۔ لہذا رونا تنہا کوئی ضمانت نہیں ہے' عاطفہ کوئی چیز نہیں ہے۔ جن کا شہادت امام حسینؑ کے بارے میں کوئی موقف نہ ہو یا وہ اہداف امام حسینؑ کو قتل کر رہے ہوں اُن کا رونا کسی کام کا نہیں ہے۔ ہمیں اس سلسلے میں سوچنا ہوگا غور کرنا ہوگا تاکہ ہمیں یقین ہو جائے کہ ہم قاتلین امامؑ میں سے نہیں ہیں۔ صرف ہمارا یہ کہنا کہ ہم انؑ سے محبت کرتے ہیں ہم انؑ کی زیارت کو جاتے ہیں' ہم روتے ہیں' ہم پاپیادہ زیارت کو جاتے ہیں' واقعاً یہ سب باتیں عظیم ہیں' ممتاز ہیں۔ لیکن صرف یہ رجحانات کفایت نہیں کرتے۔ ہمارے پاس ٹھوس دلیل نہیں ہے کہ ہم یہ ثابت کریں کہ ہم نہیں بھولیں گے۔ ممکن ہے انسان عاطفی طور پر قیام کرے لیکن عین موقع پر قاتلین امامؑ کے ساتھ عملاً

شریک ہو۔ اپنے نفس کا خیال رکھنا چاہیے۔ اپنے مؤقف کا امتحان لینا چاہیے۔ تدبر کرنا چاہیئے' حالات کا احاطہ کرنا چاہیے۔ تقاضوں کو کھلے دل سے سوچنا چاہیئے تاکہ واضح ہو کہ ہم بالواسطہ یابلاواسطہ قاتلین امامؑ کے ساتھ شریک نہیں ہیں۔

ہزیمت خوردہ اخلاق کا ایک ارادت مند اخلاق میں تبدیلی

امت کا اخلاق جب ہزیمت خوردہ ہو جاتا ہے توان کے ارادے بھی مردہ اور بے جان ہو جاتے ہیں۔ ان سے انکی شخصیت چھن جاتی ہے۔ لہٰذا ان کا وہ ہزیمت خوردہ نفس جس کے ساتھ وہ زندگی گزار رہے ہوتے ہیں ایسی شکل اختیار کر لیتا ہے کہ اسے کرامت و شخصیت کا احساس ہی نہیں ہوتا ہے۔ راستہ اور ہدف واضح ہے' حق وباطل میں تمیز کی قدرت بھی موجود ہے' اس کے باوجود معاویہ کی تجویز یا معاویہ کا کھینچا ہوا نقشہ جس میں دور جاہلیت کو اسلام کے لباس میں پیش کیا گیا ہے منکشف ہو جاتا ہے۔ ان کیلئے علیؑ کا نقشہ بھی واضح وروشن ہو گیا' جو کہ اسلام کا حقیقی چہرہ ہے۔

اسی طرح امام حسینؑ دو قسم کے اخلاق کے بیچ میں کھڑے تھے' ایک وہ ہزیمت خوردہ اخلاق تھا جس میں عاشور سے پہلے امت اسلامی مبتلا تھی اور دوسرا وہ اخلاق جسے امام حسینؑ امت میں پیدا کرنا چاہتے تھے یا نشر کرنا چاہتے تھے۔ وہ اخلاق یہ تھا کہ امت صاحب ارادہ بن جائے عزم واستقلال اور جذبہ قربانی ان میں پیدا ہو جائے۔ آپؑ کو اس اخلاق کا بھی سامنا تھا جو صرف مفاہیم کی حد تک کا تصور تھا' عمل سے دور تھا۔ اس اخلاق میں سلب وایجاب تھا و نفی واثبات تھا یہ وہ اخلاق تھا جو قوت تحرک کو شل کر چکا تھا' امامؑ اس اخلاق میں حرکت کے بغیر صرف تغیر لانا چاہتے تھے۔ امامؑ کو اس اخلاق کا سامنا تھا جس کی مثال اخنف بن قیس کے کلام سے ملتی ہے۔ جب اس نے امام حسینؑ کے رکاب میں حرکت کرنے والوں کے بارے میں اظہار خیال کیا۔ وہ کہتا ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جن کو اپنے موقف پر یقین

نہیں، مسائل کی تحقیق سے پہلے جلدبازی کرتے ہیں' حالات کے پیش آنے سے پہلے خود کو پیش کرتے ہیں۔ یہ احنف بن قیس کی سوچ ہے۔ یہ ایک ایثار و قربانی کے علمبردار کا ہزیمت خوردہ اخلاق ہے۔ وہ اس قربانی کو' اس اقدام کو جو انسان کو موت کی طرف لے جاتی ہے' جلدبازی سے تعبیر کرتا ہے' صبر کے خلاف اقدام قرار دیتا ہے' اسے عقل و منطق کے دائرہ سے باہر قرار دیتا ہے۔ احنف بن قیس کی یہ سوچ امت کے ہزیمت خوردہ اخلاق کا نتیجہ ہے۔ یہ مفہوم حرکت امام کے بعد پارہ پارہ ہو گیا۔ شہادت امام حسینؑ کے بعد امت کے اندر جذبۂ قربانی آیا' جانفشانی کیلئے آمادہ ہوئے' حرکت توابین کے نام سے چار ہزار لشکر نے قیام کیا۔ ان کا کوئی ہدف نہیں تھا وہ صرف جان دینا چاہتے تھے تاکہ ان کے اپنے گناہوں کا کفارہ ہو جائے یعنی امام سے جو منفی رویہ اپنایا تھا اس کا کفارہ ہو جائے۔

وہ اخلاق جس کا مظاہرہ آپؑ کے رضائی بھائی عمر اطرف کے اس جملہ سے ہوتا ہے: ''یزید کی بیعت کرنا قتل ہو جانے سے بہتر ہے''۔ یہ ان کا ہزیمت خوردہ اخلاق تھا لیکن قیام امام حسینؑ کے بعد یہ پسپا اخلاق جاتا رہا۔

علی بن الحسینؑ کا یہ جملہ کہ جب آپؑ نے اپنے بابا سے پوچھا: باباجان! کیا ہم حق پر نہیں ہیں؟ تو امامؑ نے فرمایا: ہم حق پر ہیں یہ سن کر علیؑ (اکبر) نے جواب دیا اگر ہم حق پر ہیں تو کوئی پروا نہیں کہ موت ہم پر گرے یا ہم موت پر۔

آپؑ کے بھائی محمد حنفیہؒ نے امام حسینؑ سے فرمایا: مجھے ڈر ہے کہ آپؑ کسی ملک میں داخل ہو جائیں گے پھر لوگ آپؑ سے اختلاف کریں گے۔ بعض لوگ آپؑ کا ساتھ دیں گے بعض آپؑ کے مخالف ہونگے۔ دوست و دشمن کے درمیان جنگ ہوگی' خون بہے گا۔ لہٰذا بہتر ہے آپؑ میدان جنگ سے دور رہیں اپنے پیغامات کو لوگوں تک پہنچائیں' اپنے مخبروں کو لوگوں کے مابین چھوڑیں اور ان کے ذریعہ

لوگوں کو دعوت دیں۔ اگر انہوں نے دعوت قبول کی تو بہتر ہے اگر قبول نہ کی تو آپؑ اپنے دین کے ساتھ محفوظ تو رہیں گے۔ یہ ان کی اخلاقی پسپائی تھی جس سے دلوں پر تالے لگے ہوئے تھے، جس کی کایا شہادت کے بعد پلٹ گئی اور امام حسینؑ کے خون مُطہر نے امت کی بیداری کیلئے چابی کا کام کیا جبکہ محمد حنفیہؒ سمجھ رہے تھے یہ خون ضائع ہوگا۔ مختار نے زندان میں کہا تھا مجھے وہ کلمہ معلوم ہے جس سے ہم پوری سرزمین عرب پر حکومت کر سکتے ہیں۔ یہ وہی خون ہے جس کے بارے میں سوچا جارہا تھا کہ ضائع ہوگا مگر یہ سلطنت وقت کی چابی بنی ہے۔

بنوامیہ کے امیر یزید نے آل ابی طالبؑ سے متعلق عبیداللہ کو خط میں لکھا یہ لوگ جلد ہی خون بہانے پر اتر آئیں گے۔ یہ ان کے پسپا شدہ اخلاق کی ترجمانی کرتی ہے۔ جب پسپائی نے ان کے اخلاق اور وجود میں جڑ پکڑلی تو امام حسینؑ نے ان کے خلاف قیام فرمایا۔ آپؑ نے فیصلہ کیا ایک ایسے اخلاق کی طرف لوگوں کو لانے کیلئے ایسا خون بہایا جائے، جس سے ارادہ زندہ ہو، صحیح اسلامی اخلاق زندہ ہو جائے۔ مسلمان کو اپنے صحیح مؤقف اور اپنی ذمہ داری کا احساس ہو جائے، جسے شریعت مختص کرتی ہے۔ ایسی تبدیلی لانے میں امام حسینؑ دقیق ترین مراحل سے گزرے۔ اس وقت امام حسینؑ چاہتے تھے کہ امت کے جسم اور ضمیر و وجدان میں نئے اخلاق کا بیج بو دیا جائے۔ امامؑ اس وقت انتہائی دقت اور باریک بینی سے نگرانی فرمارہے تھے۔ لوگ ہزیمت خوردہ اور کمزور تقلیدی اخلاق سے نکلنا نہیں چاہتے تھے۔ لہٰذا امامؑ نے تمام تر کوشش یہ کی کہ اس پسپائی کا شکار اخلاق کے خلاف قیام نہ کریں کیونکہ آپؑ امت کی تربیت نئے اخلاق کے ذریعے کرنا چاہتے تھے۔ امت کے ضمیر و وجدان کو حرکت میں لانا چاہتے تھے۔ یہ آپؑ کیلئے اس وقت ہی ممکن تھا جب آپؑ ایک جائز راستے سے قیام کریں۔

جس امت کے ارادے مردہ ہو چکے ہوں' اخلاقیات میں نمایاں پسپائی' مفاہیم تبدیل ہو چکے ہوں' ان تمام خدشات کا خیال رکھنا امامؑ کیلئے ضروری تھا۔ دقیق منصوبہ بندی اور نقشے کے تحت امامؑ کو چلنا تھا۔ غیر طبیعی طریقے سے نہیں بلکہ قانونی اور شرعی طریقے سے امت کے اخلاق کو جھنجوڑ کر اس سے پسپائی کو دور کرنا ہے۔ ان کے تبدیل شدہ مفاہیم کی جگہ اصل مفاہیم کو پیدا کرنا ہے۔ لہٰذا آپ اس مقصد کیلئے منصوبہ بندی کرتے رہے۔ آپؑ نے پہلے ہی دن سے ایک ایسے مثبت' واضح اور روشن مؤقف کو اپنے اور خدا کے درمیان اختیار کیا کہ آپؑ کو کسی صورت اس معرکہ میں کودنا تھا جس کیلئے خواہ کتنی ہی قیمت کیوں نہ ادا کرنی پڑے۔ آپؑ نے ہر چیلنج کا مقابلہ کرنے اور آخری دم تک لڑنے کا تہیہ کر لیا تھا۔

آپؑ امت کی حرکت کے ردِ عمل میں حرکت نہیں کر رہے تھے بلکہ ان کے رد عمل کی مناسب اصلاح پیش کر رہے تھے۔ آپؑ طبیعی راستے سے حرکت کر رہے تھے اس کی دلیل یہ ہے کہ امام حسینؑ نے بصرہ میں اپنے وابستہ شخصیات کو خط لکھا۔ ہمیں تاریخ میں نہیں ملتا ہے کہ امام حسینؑ نے کوئی کھلا خط کوفہ والوں کے نام لکھا ہے یا نہیں لیکن آپؑ نے بصرہ میں موجود آپؑ سے وابستگی رکھنے والوں کو خط لکھ کر دعوت کا آغاز کیا۔ آپؑ نے یہ اعلان کیا کہ ہم بنوامیہ کے خلاف قیام کرنے والے ہیں ان پر یہ واضح کر دیا کہ اس خط کا قاصد ان کی نمائندگی کرتا ہے اور آپ اپنے بھائی اور پدر بزرگوار کی نمائندگی کر رہے ہیں۔ آپؑ نے فرمایا :

''میں ابھی تک خاموش رہا۔ میرے باپ اور میرے بھائی نے خاموشی اختیار کی۔ یہاں تک کہ بنوامیہ قرآن و سنت کی پاسداری کو چھوڑنے لگے۔ جب کتاب و سنت کی ہتک حرمت ہونے لگی' سنت مردہ ہو چکی' بدعت عام ہو چکی' تو میرے لئے ضروری ہو گیا کہ قیام کروں اور تبدیلی کیلئے اٹھوں۔

تمہارے اوپر بھی فرض ہے کہ تم لوگ بھی اپنے مؤقف کو واضح کرو"۔

آپؑ نے اپنے خطوط کے ذریعے اپنی دعوت کے بارے میں اپنے نظریئے کو واضح کیا۔ ان کو دعوت دی کہ وہ آپؑ کے قیام کے ابتدائی مراحل میں ہی شامل ہو جائیں۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ امام حسینؑ اپنے مؤقف کی حمایت صرف عاطفہ سے دینے کے حق میں نہیں تھے بلکہ آپؑ یہ بھی نہیں چاہتے تھے کہ لوگ صرف لفظی یا زبانی طور پر آپؑ کا ساتھ دیں۔ آپؑ پہلے ہی دن سے امت کو ہدف کے ساتھ حرکت میں لانا چاہتے تھے۔

جب والئ مدینہ نے آپؑ کو نصف شب اپنے پاس بلایا اور یزید کیلئے بیعت طلب کی تو آپؑ نے اسی وقت اس پر یہ واضح کر دیا کہ حسینؑ کو یزید کی بیعت قبول نہیں ہے۔ یہ حقیقی معنوں میں بیعت کو مسترد کرنے کی ایک صورت تھی۔ اس کے بعد آپؑ نے واضح انداز میں فرمایا کہ خلافت کے لائق و سزاوار صرف آپؑ ہیں۔ آپؑ نے والئ مدینہ سے فرمایا: تم بھی صبح کرو، ہم بھی صبح کرتے ہیں۔ تم بھی دیکھو! ہم بھی دیکھیں گے کہ کون اس منصب کیلئے سزاوار ہے۔

آپؑ کا یہ عزم و ارادہ اور اس طرح کی حرکت حاکم وقت کے خلاف ایک واضح قیام تھا، چیلنج تھا۔ بصرہ والوں کو جو خط لکھا وہ حکومت وقت کیلئے چیلنج تھا۔ یہ سب وہ قرائن، دلائل اور شواہد ہیں کہ امامؑ پہلے ہی دن سے منصوبہ بندی کر رہے تھے۔ آپؑ امت کو حرکت میں لانا چاہتے تھے، چاہے حالات جو بھی ہوں۔

امام حسینؑ کا اپنے موقف کی توجیہ میں شعار

امامؑ اس اخلاقی پسپائی کی شکار امت کیلئے شعار بلند کرتے تھے۔ وہ امت جو روحی و نفسیاتی طور پر شکست خوردہ تھی اور اتنی متاثر کہ اس کے ارادے ختم ہو چکے تھے۔ آپؑ ہر موقع پر واضح اور روشن انداز میں شعار دیتے تھے۔ چونکہ اس

ہزیمت خوردہ اخلاق میں یہ امت مبتلا تھی امامؑ کیلئے اس کا مقابلہ کرنا ضروری تھا۔ اگر وہ اس اخلاق کے خلاف براہ راست مقابلہ کو نکلے تو وہ اپنے عمل کی شرعی حیثیت کو کھو بیٹھیں گے۔ امامؑ کا یہ عمل ان کے ضمیر کو بیدار نہیں کر سکتا۔ چنانچہ ان کو حرکت میں آنا چاہیئے۔

پہلا شعار : قتل ناگزیر ہے۔ کچھ لوگ امامؑ پر اعتراض کرتے تھے کہ آپؑ کیوں قیام کر رہے ہیں۔ عبداللہ بن زبیر وغیرہ نے اس قسم کے اعتراضات کیئے تھے۔ آپؑ نے ان کے جواب میں فرمایا :

"مجھے ہر حال میں شہید ہو جانا ہے۔ میں حشرات الارض کے بلوں میں چھپ جاؤں تب بھی یہ لوگ مجھے نہیں چھوڑیں گے۔ میں جہاں بھی چلا جاؤں بنوامیہ پیچھا نہیں چھوڑیں گے۔ مجھے ہر حال میں مرنا ہے۔ چاہے میں مکہ میں رہوں یا مکہ سے باہر جاؤں۔ بہتر ہے کہ میرا قتل مکہ میں نہ ہو تاکہ اس گھر کی حرمت باقی رہے"۔

آپ دیکھیں گے کہ یہ شعار واقعیت سے کتنی مطابقت رکھتا ہے' وہ اخلاق جو زندہ رہنے کا خواہش مند ہے یہ پسپا' ہزیمت خوردہ اخلاق ہے۔ ان کے پاس کوئی منطق نہیں جو ان کو نجات دلادے' ان کیلئے قابل ہضم ہو۔

وہ یہ منطق نہیں رکھتے تھے کہ امامؑ کی اس تحریک پر تنقید کریں۔ امامؑ نے فرمایا :

"نشانات' شواہد' قرائین بتاتے ہیں کہ میں مارا جاؤں گا۔ بنوامیہ یہ عہد کر چکے ہیں کہ مجھے قتل کریں' اغوا کریں یا دھوکا دے کر قتل کریں خواہ میں استار کعبہ سے کیوں نہ چمٹ جاؤں"۔

آپؑ اس لئے شعار دیتے تھے تاکہ آپ کے موقف کی وضاحت ہو جائے۔ اس قسم کی پسپائی کی شکار قوم کے ساتھ یہی مناسب تھا یعنی جب ایک انسان کو

مرنا ہی ہے تو کیوں نہ آزاد مرے۔

دوسرا شعار : امام حسینؑ کی یہ حرکت ایک حکم غیبی کے تحت تھی۔ مختلف شخصیات آتی ہیں اور اعتراض کرتی ہیں کہ آپؑ کیوں قیام کرتے ہیں۔ جب محمد حنفیہ نے آپؑ سے بہت ساری نصیحتیں کیں تو آپؑ نے فرمایا: ''دیکھوں گا! میں سوچوں گا!'' محمد حنفیہ اٹھ کر چلے جاتے ہیں۔ بعد میں خبر ملتی ہے کہ امام حسینؑ نکل گئے ہیں تو محمد حنفیہ جلدی آتے ہیں اور زمام ناقہ کو پکڑ کر پوچھتے ہیں: برادر! آپؑ نے مجھے وعدہ نہیں دیا تھا؟ آپ نے نہیں کہا تھا کہ سوچیں گے۔ آپؑ نے فرمایا ہاں! میں نے ضرور کہا تھا لیکن رات کو پیغمبر اکرمؐ خواب میں آئے اور فرمایا: مجھے قتل ہونا ہے۔ جب آپؑ نے یہ جواب دیا' خواب کو ایک غیبی فیصلے کی صورت میں سنایا تو پسپائی خوردہ اخلاق کیلئے آپؑ کا یہ جواب قابل انکار نہیں تھا۔ صاحب اخلاق کو جب تک حسینؑ پر ایمان ہو وہ آپؑ سے یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس غیبی فیصلہ کو رد کریں۔ اس قسم کا اخلاق رکھنے والا امامؑ کی اس منطق کو رد نہیں کر سکتا جسے امامؑ کے خواب پر ایمان ہو وہ اس سے انکار کیسے کر سکتا ہے۔ امام حسینؑ نے خواب کے بارے میں محمد حنفیہ کو بتایا لیکن عبداللہ بن زبیر کو نہیں بتایا کیونکہ وہ آپؑ کے خواب پر ایمان نہیں رکھتے تھے۔ یہ ایک شعار ہے جس کا رخ حتمی موت کی طرف ہے۔

امامؑ نے فرمایا: ''میری موت کا فیصلہ اوپر سے ہو چکا ہے مجھے قربان ہونا ہے مجھے سفر پر جانا ہے' گرچہ قتل بھی ہو جاؤں''۔

یہ ایک ایسا شعار ہے جو واقعیت سے مجسم ہے پھر بھی یہ ایک شعار حقیقی ہے۔

تیسرا شعار اہل کوفہ کی دعوت کو قبول کرنا ضروری تھا۔ آپؑ نے بہت سی جگہوں پر لوگوں سے خطاب کیا۔ وہاں فرمایا مجھے اہل کوفہ کی طرف سے دعوت ملی ہے' انہوں نے مجھے بلایا ہے' حالات سازگار ہیں کہ میں وہاں جاؤں اور حق کی

مدد کروں اور باطل کو ختم کر دوں۔ تو لوگوں کی طرف سے اس کے رَدِّ عمل میں باتیں ہوتی تھیں۔ لوگ آپؑ کے سفر کے خلاف طرح طرح کی تفاسیر کرتے تھے۔ آپؑ فرماتے ہیں: میرا کوفہ جانا اور ان کی دعوت قبول کرنا۔ ان کے طلب کا جواب ہے۔ امت حرکت میں آچکی ہے ارادہ کر لیا ہے۔ لہٰذا ان پر واجب ہے کہ حرکت کریں۔ امام حسینؑ اس واقعہ میں مرحلۂ جہادی پر اکتفاء نہیں کرتے یہ نہیں فرماتے کہ امت نے میری قیادت طلب کی ہے۔ اگر صرف امت کی دعوت پہ جا رہے تھے تو بصرہ والوں کو خط نہ لکھتے۔ امامؑ نے خود بھی دعوت دی تھی' نصرت طلب کی تھی۔

امام حسینؑ ایک شخص سے کہتے ہیں کہ اہل کوفہ کی دعوت پر ان کی طرف جا رہا ہوں' لیکن حالات میں فرق ہے۔ ایک انسان حرکت کرتا ہے' ایک انسان کسی امت کی دعوت کو قبول کر کے جو ان پر ایمان لائے ہیں' ان کی قیادت پر ایمان لائے ہیں یہاں پر ایک اخلاقی شکست ہے وہ یہ کہ جلدی انجام پذیر ہونے میں بعد میں شکست ہوتی ہے ایسے موقعوں پر عاقبت کے بارے میں نہیں سوچا جاتا۔ جب امام حسینؑ کا یہ عمل اجابت دعوت ہے تو کیا حالات سازگار تھے؟ شکستہ اخلاق والے نہیں کہہ سکتے کہ عمل دیوانہ پن پر مبنی ہے یا غیر تجزیہ شدہ حرکت ہے۔ لہٰذا آپ ان کی دعوت کو قبول نہ کریں۔

چوتھا شعار حکومت وقت کے خلاف قیام ضروری ہونا ہے۔ کبھی امام حسینؑ ان تمام شعار کے مقابلے میں یہ بھی فرماتے تھے کہ پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا ہے کہ اگر کسی حاکم' سلطان جائر کو خدا کے نازل کردہ احکام کے خلاف حکم کرتے ہوئے دیکھیں اور لوگ اپنے قول و فعل سے اسے نہ روک سکیں تو خدا پر واجب ہے کہ ان لوگوں کو جہنم میں ڈال دے۔ اس شعار سے متعلق جو شریعت کے عین

مطابق ہے یہ امت کیا کہہ سکتی تھی۔

اخلاق ہزیمت خوردہ سے استفادہ کرنے کے چند طریقے ہو سکتے ہیں :

ا۔ آپؑ نے جنگ کا آغاز نہیں کیا : یہ اُن طریقوں میں سے ایک ہے جسے آپؑ نے اپنایا۔ آپؑ نے اس ہزیمت خوردہ اخلاق کے ساتھ اس طرح کا رویہ اختیار کیا کہ یہ اخلاق ہزیمہ بتدریج اخلاقِ ایثار میں بدل جائے۔ آپؑ نے فرمایا کہ میں جنگ کے سلسلہ میں دوسروں سے پہل نہیں کروں گا۔ یہ وہ شعار ہے جسے حضرت علیؑ نے بلند کیا تھا۔ فرق یہ ہے کہ علیؑ رئیس حکومت اسلامی تھے۔ چنانچہ بحیثیت حاکم آپؑ کیلئے ضروری تھا کہ جنگ میں ابتدا نہ کریں۔ اطاعت کی ریسمان کو نہ توڑیں اور آپؑ کے خلاف کہیں اعلان بغاوت نہ کریں۔ مفروض یہ تھا کہ جناب عائشہؓ سے جنگ میں علیؑ پہل نہ کرتے، طلحہ وزبیر سے جنگ میں پہل نہ کرتے، کیونکہ وہ آپؑ کے ہمشہری تھے، جب تک حد سے تجاوز نہ کر گئے۔ آپؑ نے اُن کے خلاف جنگ نہیں کی۔ لیکن یہاں امام حسینؑ انقلاب کیلئے نکلے تھے۔ آپؑ ایک ایسے حکمران کے خلاف کھڑے ہوئے تھے جو ظالم و جابر تھا۔ اس سے جنگ میں پہل نہ کرنے کی منطق بظاہر صحیح نہیں لگتی۔ لیکن امام حسینؑ نے اس شعار کو بھی اپنایا تاکہ اخلاق شکستہ سے سازگار ہو جائے اور امام حسینؑ کیلئے اپنے اس عمل کو شرعی بنانے میں رکاوٹ باقی نہ رہے۔

حُر کی قیادت میں آئے ہوئے اس لشکر سے امام حسینؑ ملتے ہیں جو آپؑ کا راستہ روکنے آئے تھے۔ یہ لشکر ایک ہزار کا تھا۔ زہیر ابن القین نے آپ کو ان سے جنگ کرنے کی پیشکش کی۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ اس لشکر سے جنگ کرنا آسان ہے۔ ہم جنگ کا آغاز کریں اور کوفہ جانے کا راستہ کھل جائے گا۔ لیکن امامؑ نے فرمایا جنگ

کرنے میں پہل نہیں کروں گا۔ یہ اس شعار کا مصداق ہے جسے آپؑ کے نمائندے مسلم بن عقیلؒ نے کوفہ میں اپنایا تھا۔

ا۔ جنگ میں پہل نہ کرنا

بعض اذہان میں شک وتردد کی صورت میں یہ سوچ ابھرتی ہے کہ مسلم بن عقیلؑ حالات کا صحیح طریقے سے جائزہ لینے میں ناکام رہے۔ حوادث کا بصیرت سے موازنہ نہ کر سکے۔ مسلم کو چاہئے تھا کہ کوفہ میں داخل ہوتے ہی حالات کو اپنے کنٹرول میں لے لیتے۔ یہ تصور اس وقت صحیح اور مفید تھا اگر حسینؑ بن علیؑ کی طرف سے مسلم حاکم ووالی بن کر گئے ہوں گویا امامؑ نے اپنی حکومت قائم کرلی ہو اور مسلمؑ کو حاکم کوفہ بنا کر بھیجا ہو۔ تاریخی نصوص میں کوئی نص یا دلیل نہیں ملتی کہ امامؑ نے مسلمؑ کے ساتھ کوئی ایسا خط لکھا ہو یا کوئی اشارہ دیا ہو جس سے یہ ثابت ہو جائے کہ مسلمؑ کو آپؑ نے اختیار دیا تھا کہ وہ ضرورت پڑے تو جنگ کریں اور دارالامارہ پر قبضہ کرلیں۔ جبکہ آپؑ نے کوفہ والوں کو لکھا کہ میں اپنے اہل بیت کے معتمدترین شخص کو تمہاری طرف بھیج رہا ہوں تاکہ تمہارے حالات سے آگاہی حاصل ہو سکے اور تمہارے اخلاص کے بارے میں اطمینان حاصل ہو سکے۔ اگر مسلم مجھے لکھتے ہیں کہ تمہارے خطوط اور تمہارے نمائندوں پر اعتماد کیا جاسکتا ہے تو میں اسکی موافقت میں تمہاری دعوت کو قبول کروں گا، اور تمہاری طرف آجاؤں گا۔ جناب مسلمؑ اس خط کے مضمون کی حد تک مکلّف تھے۔ ان کا کام صرف یہ تھا کہ کوفہ کی عوامی رائے عامہ کو معلوم کریں اور اس سے امامؑ کو آگاہ کریں۔ آپ کو اس سے زیادہ ذمہ داری نہیں دی گئی تھی۔ چنانچہ مسلم بن عقیلؑ نے اس سے زیادہ اقدام نہیں کیا۔

آپ کوفہ میں داخل ہوئے، مختار کے گھر قیام کیا۔ یہ گھر شیعہ دوستوں کیلئے

کھلا رہتا تھا۔ آپ اپنے دوستوں کو اہداف امام حسینؑ سے واقف کراتے تھے اور یہ لوگ بھی اپنے خلوص کا یقین دلاتے تھے۔ لوگ ان اہداف کے حصول میں خود کو مستعد اور آمادہ ہونے کا اعلان کرتے تھے۔ یہاں تک کہ عبیداللہ بن زیاد کوفہ میں داخل ہوا۔ حالات بدل گئے۔ جب مسلمؑ نے ان بدلتے ہوئے حالات کو دیکھا تو مصلحت یہ سمجھی کہ کسی اور گھر میں پناہ لے لیں۔ اب مسلمؑ نے روپوشی اختیار کر لی۔ چونکہ عبیداللہ ابن زیاد کو ان کے پیچھے لگنا تھا' انہیں کسی صورت تلاش کرنا تھا جبکہ سابق والیٔ کوفہ نعمان ابن بشیر اس سلسلے میں عدم تعرض کا رویہ رکھتا تھا۔

ابن زیاد اس اجتماع سے مقابلہ کرنے اور اس تجمع کے اسباب و عوامل کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ جب مسلم بن عقیلؑ نے ہانی ابن عروہؓ کے گھر روپوشی اختیار کی وہاں بھی شیعہ جمع ہوتے تھے۔

جناب مسلم بن عقیلؑ اس وقت منظر عام پر آئے جب ہانی بن عروہ کو گرفتار کر لیا گیا اور ان کی رہائی کیلئے آپ کے ساتھ چار ہزار لشکر بھی نکلا' آپ نے چاہا کہ اس لشکر کی مدد سے دارالامارہ پر قبضہ کریں اور حکومتی باگ ڈور کو اپنے ہاتھ میں لے لیں۔ لیکن یہ عمل آپ کے بنائے ہوئے منصوبہ کی حد سے باہر تھا۔ جس منصوبہ کا آپ اور امام حسینؑ کے درمیان اتفاق ہوا تھا اس میں یہ منصوبہ نہیں تھا۔ یہ عمل مسلم کا اپنی حیثیت سے دفاع تھا۔ کیونکہ مسلم دفاعی پوزیشن میں تھے اور ابن زیاد نے ہجوم کیا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس تحریک کے مرکز کو ختم کر دے اس بنیاد کو ختم کر دے۔ مسلم جنگ نہیں کر رہے تھے۔ حالات نے انہیں مجبور کیا تھا کہ وہ اس پوزیشن میں آجائیں۔ اگر آپ یہ اقدام نہیں کرتے تو عبیداللہ کا لشکر ہجوم کرتا اور شیعوں کو ختم کر دیتا۔ ایسا کرنا آپ کے اوپر فرض تھا۔ امامؑ حسینؑ کی طرف سے حکم نہیں تھا اور نہ یہ عمل آپ بطور حاکم انجام دے رہے تھے۔ مسلم ایک فرد

تھے جن کا پیچھا ہو رہا تھا۔ آپ اپنے دفاع کیلئے پہل کر رہے تھے۔ جس طرح اپنے نفس اور اہل و عیال کا دفاع کرنا لازمی ہے آپ بھی اپنے نفس اور اپنے ماننے والوں کا دفاع کر رہے تھے۔

آپ اس خط کو پڑھیں جسے امام حسینؑ نے قیس بن مسہر صیداویؓ کے ساتھ بھیجا تھا۔ خط میں لکھا تھا کہ میں (حسینؑ بن علیؑ) بہت جلد تم تک پہنچنے والا ہوں اپنے امور کو منظّم انداز میں بجالاؤ تاکہ میرے آنے تک شیرازہ نہ بکھر جائے۔ اس خط میں امامؑ نے کسی ایسے منصوبہ کے بارے میں نہیں لکھا جس میں یہ حکم ہو کہ آپ حاکم یا والی کے حوالے سے مسلط ہو جایئے۔ خط میں تو اپنی حفاظت کرنے کی بات تھی، اجتماع کو آپؑ کے تشریف لانے تک یکجا رکھنے کی بات تھی۔ مسلم کی ذمہ داری تھی کہ اس اجتماع کا تحفظ کریں یہاں تک کہ امام حسینؑ کوفہ تشریف لائیں اور اجتماع کو سنبھالیں۔ یہ سب امام حسینؑ کے کوفہ میں داخل ہونے پر موقوف تھا۔ لہٰذا امام نے سفارش کی تھی کہ اس اجتماع کو محفوظ رکھیں، احتیاط سے رکھیں۔ امامؑ کے خط میں صرف ایک عبارت تھی وہ یہ کہ مسلم کوفہ کے حالات سے انہیں آگاہ کرتے رہیں، ضروری معلومات فراہم کریں۔ مسلم کو جنگ کرنے کا اختیار یا ہدایت نہیں دی تھی۔ لہٰذا مسلم اس وقت اٹھے جب دفاع کی نوبت آ پہنچی، کوئی اور راستہ نہیں تھا۔ یہ سب در حقیقت جنگ میں پہل نہ کرنے کے اس شعار کی آواز ہے۔

امامؑ کا اس قسم کے شعار کا بلند کرنا ایک مفروضہ تھا تاکہ لوگ یہ سمجھیں کہ یہاں عمل شک پر موقوف ہے۔ امامؑ اس وجہ سے جنگ کرنے میں دیر نہیں کر رہے تھے جبکہ عام مسلمان بھی اس کو جائز سمجھ رہے تھے بلکہ یہ امت کے اس ہزیمت خوردہ روح کے مقابلے میں تھا۔ جب ہم دیکھتے ہیں کہ امام حسینؑ عازم

عراق ہوئے آپؑ ہمیشہ سفر کو جاری رکھنے کی تاکید فرماتے ہیں۔ بار بار اس منطق کو اٹھاتے ہیں کہ انہوں نے بلایا ہے۔ ہمارے اوپر فرض ہے کہ اس دعوت کو قبول کریں۔ راستے میں مسلم کی شہادت کی خبر ملی۔ آپ کے موقف میں تبدیلی نہیں آئی۔ شعار امامؑ سے ساقط نہیں ہوا' شعار بلند ہی رہا۔ آپؑ مسلم کی شہادت کے بعد بھی یہ فرماتے رہے کہ کوفہ والوں نے دعوت دی ہے فرض بنتا ہے کہ اس دعوت کو قبول کریں۔ ہانی بن عروہ کی شہادت کے بعد بھی آپؑ کا موقف نہیں بدلا۔ آپؑ کے قاصد قیس بن مسہر صیداوی کی شہادت کے بعد بھی آپؑ کا وہی رویہ بر قرار رہا۔

حر ابن یزید ریاحیؓ نے آپؑ کا راستہ روکا۔ طرماح سے ملے انہوں نے امامؑ سے عرض کیا آپؑ اس پہاڑ پر چلے جائیں ہم قبائل سے بیس ہزار کا لشکر جمع کر کے لائیں گے جو کوفہ والوں کا نعم البدل ہوگا۔ یہاں بھی امامؑ نے فرمایا میرا ان سے معاہدہ ہے مجھے کسی صورت جانا ہی ہے۔ کوفہ والوں کے تمام عہدو پیمان کے ٹوٹنے کی ساری علامتیں ظاہر ہونے کے بعد بھی امامؑ کا اپنے وعدہ پر باقی رہنا اس بات کا ثبوت ہے کہ امامؑ نہیں چاہتے تھے کہ خود کو بری الذمہ قرار دے دیں۔ صرف ان کی وعدہ خلافی کو بنیاد بنانا اطمینان بخش نہیں تھا۔ آپؑ یہ نہیں فرماتے تھے کہ اب میرا وہاں جانا نتیجہ خیز نہیں رہا ان کی دعوت کی اجازت ضروری نہیں۔

راستے میں پتہ چلا کہ عوامی تائید ختم ہو چکی ہے لوگوں نے خیانت کی ہے۔ آپؑ کے نمائندے کو شہید کیا ہے۔ اس کے باوجود سفر جاری رکھنا ایسا شعار ہے جو اس اخلاق کے ساتھ سازگار تھا جس کے بل بوتے پر یہ امت زندگی کر رہی تھی۔ امامؑ کیلئے ضروری تھا کہ اس شعار کو بلند کرتے تاکہ اپنے اس عمل کو ان کی نظروں میں جو سلامت رہنا چاہتے تھے' ان کی نظر میں جو اس عمل کو غیر عقلی اور بے صبری پر مبنی اقدام سمجھ رہے تھے قانونی و شرعی حیثیت دے سکیں۔

ہزیمت خوردہ اخلاق سے استفادہ کرنے کا دوسرا نمونہ میدان جنگ میں تمام عواطفی احساسات کو حرکت میں لانا تھا۔ آپؑ نے اس سلسلے میں اپنی پوری طاقت و قدرت کو جمع کیا اور اپنے آپؑ کو شہادت کیلئے پیش کیا تاکہ ہزیمت خوردہ اخلاق والے یہ نہ کہیں کہ ایک شخص جو سلطنت چاہتا تھا قتل ہوا بلکہ لوگ یہ کہیں کہ نہیں انہوں نے چاہا خود قتل ہو جائیں' انکی اولاد قتل کردی جائے۔ خواتین کو اسارت کیلئے آمادہ کیا تاکہ یہ ثابت کریں کہ ایک انسان جتنی مصیبتیں' درد والم برداشت کرنا پڑے کرے تاکہ ہزیمت خوردہ اخلاق اس قیام کے بارے میں جتنا بھی شک کر سکتا ہے کرے لیکن یہ شک نہیں کر سکتا کہ بنوامیہ کے لشکر نے عترتِ آل محمدؐ کے ساتھ جو کچھ کیا' وہ کسی صورت جائز نہ تھا اور تمام اصولوں کے خلاف تھا۔

امامؑ کیلئے ضروری تھا کہ اپنا خون' اپنی اولاد' اپنی مستورات' اہل حرم سب کو بطور عواطف پیش کریں۔ یہ وہ آثار تھے جسے دور رسولؐ اللہ سے لیکر اب تک باقی رکھا تھا۔ یہ رسولؐ کا عمامہ' آپؐ کی تلوار' عبا سب عواطف کو حرکت میں لانے میں معاون ہو سکتے تھے۔ سب کو میدان میں لائے تاکہ ہزیمت خوردہ اخلاق کو جھنجوڑ کر اُس میں تبدیلی لائیں۔ یہ ایک طریقہ تھا۔ یہ ایک احتجاج تھا۔ تاکہ حالات کے ساتھ تسلیم ہونے والے ان مردہ ضمیروں کو بیدار کر سکیں۔ چنانچہ امام حسینؑ اپنے اس منصوبہ سے ہر ہزیمت خوردہ ضمیر والے انسان کو حرکت میں لا سکے۔

قیامِ امام حسینؑ کی منصوبہ بندی سے ملنے والے دروس و عبرتیں

آپؑ نے اپنے قیام کو جس نہج پر استوار کیا ہے اس سے ہم بہت سے دروس اور عبرتیں حاصل کر سکتے ہیں جن میں سے کچھ درج ذیل ہیں :

اس امت کے اخلاق میں تبدیلی لانے والوں کیلئے ایک ایسا عمل انجام دینا جائز نہیں کہ ان میں موجود اخلاق کا دوبدو مقابلہ کیا جائے۔ کیونکہ واضح اور صریح صورت

میں اس اخلاق فاسدہ کا مقابلہ کرنے سے وہ شخص اس امت سے الگ تھلگ اور دور نظر آئے گا۔ پھر اس کا کوئی کام انجام دینا امت کی نظر میں جائز نہیں ہو گا۔

جس وقت وہ چاہے کہ اس امت کے ضمیر ووجدان کو بیدار کرے ضروری ہے کہ ان میں موجود اخلاق سے مقابلہ کرنے کی فکر کی بجائے نئے سرے سے' نئے اخلاق پیدا کرنے کا سوچے۔ جو شخص ان سے جدا ہو جائے اس کو ایسے تغیر کا راستہ اختیار کرنا چاہئے کہ امت کے ضمیر کے اندر نفوذ کر سکے۔ یہ اس صورت میں ممکن ہے کہ دِقت سے عمل کی معقولیت کا خیال رکھے اور امت میں اس عمل کو شرعی و قانونی دکھانے کی کوشش کرے۔ چنانچہ امام حسینؑ کے اس عمل کے خلاف ذرّہ برابر شک کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ سب جانتے اور مانتے تھے کہ آپؑ کا یہ عمل صحیح اور ایک عملِ مشروع تھا جبکہ بنوامیہ کا عمل ظلم وتعدّی اور جبر پر مبنی تھا۔ یہ واضح اور روشن بات ہے یہی وجہ ہے کہ مسلمان آہستہ آہستہ اپنے سابقہ اخلاق کو چھوڑ کر نئے اخلاق' نئے افکار کے دائرے میں داخل ہونے لگے۔ ان کا یہ تصور اس قدر واضح تھا کہ مسلمانوں کے ضمیر کو حرکت میں لایا اور ابھی تک حرکت میں ہے۔

خون حسینؑ اتنا کم قیمت نہیں جس سے ایک زمانے کے انسان یا ایک گروہ کے ضمیر بیدار ہو جائیں اور بس!۔ خون حسینؑ کی قیمت یہ نہیں کہ اس سے بنوامیہ کی بنیادیں ہل گئیں اور ان کے چہرہ سے پردہ ہٹ گیا۔ ایک گروہ کا بیدار ہونا کافی نہیں۔ خونِ پاک حسینؑ کی ارزش اس سے کئی گنا ہے کیونکہ یہ خون راہ خدا اور راہ اسلام میں بہا ہے۔ یہ خون ہمیشہ محرک و منور رہے گا۔ یہ خون ہمیشہ اسلام کا دفاع کرے گا۔ یہ خون ہر امت کیلئے مطہر رہے گا۔ ضروری ہے کہ ہم اور آپ سب کے ضمیر حرکت میں آئیں۔ جب بھی ہمیں کسی دھوکے کا سامنا ہو ہمیں اس عظیم قربانی کی طرف رجوع اور احساس کرنا چاہئے۔ ہمیں اپنی توجہ اس کی طرف

کرنا چاہیئے۔ ہم ہی وہ لوگ ہیں جن کو اپنی حقیر ذات کو قربان کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔ جب بھی اسلام ہم سے قربانی طلب کرے ہم کتنے ہی ضعیف و حقیر کیوں نہ ہوں اس عظیم قربانی کی طرف متوجہ ہونا چاہیئے جو قربانی کے حوالے سے لامحدود ہے جسے امام حسینؑ نے پیش کیا تھا۔ ہمیں خود کو چھوٹا نہیں دکھانا چاہیئے۔ ہر چیز کو حقیر سمجھتے ہوئے اسلام کی سربلندی کیلئے قیام کرنے کا ذمہ دار سمجھنا چاہیئے۔ اسلام قربانی چاہتا ہے۔ آپ اپنے وقت کی قربانی دیں' راحت و آرام کو قربان کریں' شخصی مصلحت کی قربانی دیں' خواہشاتِ نفسانی کی قربانی دیں' اپنی تمام توانائیوں کو جمع کریں' اپنے وسائل کو پیغام رسالت کیلئے صرف کریں۔ یہ قربانیاں اُس عظیم قربانی کے مقابلے میں کیا چیز ہیں۔

کون ہے جو اپنے خون کے آخری قطرے تک قربانیاں پیش کر سکے ؟ کون ہے جو اپنے خاندان کے آخری فرد تک کا قربانی دے سکے ؟ کون ہے جو ایک دنیادار انسان ہونے کے ساتھ ساتھ اپنی کرامات اور بخشش کی آخری حد تک قربانی پیش کر سکے ؟ ان مقاصد کو حاصل کرنے کیلئے ہمیں ہمیشہ اس عظیم قربانی کو سامنے رکھنا چاہیئے تاکہ خون حسینؑ تاریخ میں زندہ و جاوید رہے۔

غفر الله لنا ولكم

میدان جنگ میں امامؑ کے خطبات

امامؑ کا پہلا خطبہ

وہ خطبۂ مبارک یہ ہے :

"ایھا الناس اسمعوا قولی ولا تعجلونی حتی اعظکم بمالحق لکم علی حتی اعتذر الیکم ومن مقدمی علیکم فان قبلتم عذری و صدقتم قولی واعطیتمونی النصف کنتم بذلك اسعد ولم یکن لکم علیّ سبیل وان تلم تقبلوا منی العذر ولم تعطوا النصف من انفسکم فاجمعوا امرکم وشرکائکم ثمّ لا یکن امرکم علیکم غمة ثم اقضوا الیّ ولا تنظرون ان ولی الله الذی نزّل الکتاب وهو یتّولیّ الصّٰلحین اما بعد فانسبونی فانظروا من اناثم ارجعوا الی انفسکم وعا تبوها فانظروا هل یحل لکم قتلی وانتهاك حرمتی الست ابن بنت نبیکم صلی الله علیه واله وابن وصیّه وابن عمه واول المومنین بالله والمصدقِ لرسوله بماجآء به من عند ربه اولیس حمزة سید الشهدآء عمّ ابی؟ اولیس جعفر الشهید الطّیار

ذوالجناحین عمّی اولم یبلغکم قول مستفیض فیکم ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ و الہ قال لی و لاخی ھذان سیّداشباب اھل الجنّۃ"۔

"ایہاالناس! میری بات سنو اور میرے قتل میں جلدی نہ کرو تاکہ میں حق نصیحت سے جو مجھ پر واجب ہے ادا ہو جاؤں اور اپنے یہاں آنے کے عذرات تم سے بیان کر دوں۔ اگر تم نے میرا عذر قبول کیا اور میرے قول کی تصدیق کی اور میرے معاملہ میں دادِ انصاف دی تو تم اس کے سبب سے نیک ہو جاؤ گے اور مجھ پر ظلم کر نیکی راہ نہ پاؤ گے۔ اور اگر تم نے میرے عذر کو قبول نہ کیا اور طریقِ انصاف اختیار نہ کیا تو تم اپنے کام کو درست اور اپنے شرکاء کو جمع کر لو تاکہ تم پر تمہارا وہ کام اور اسکی حقیقت پوشیدہ نہ رہ جائے۔ پھر جو کچھ تم کو میرے ساتھ کرنا ہو کرنا اور مجھ کو مہلت نہ دینا۔ میرا ولی وہ خدا ہے جس نے قرآن کو نازل فرمایا اور جو صالحین ہی کو ولی بناتا ہے۔

اتنا کہہ کر جناب امام حسین علیہ السلام نے اتنی دیر تک اور انتظار کیا کہ عمر سعد کی فوج کے لوگ ایک جا جمع ہو کر مخاطب ہو جائیں۔ جب وہ جمع ہو گئے تو پھر آپؑ نے سلسلۂ بیان کو یوں شروع فرمایا کہ :

ایہاالناس! اے گروہِ کوفہ و شام! تم لوگ میرے حسب و نسب پر لحاظ کرو اور دیکھو کہ میں کون ہوں۔ بعدہ' اپنے دل میں غور کرو اور اپنے نفوس کو ملامت کرو اور چشمِ انصاف سے دیکھو کہ آیا مجھے قتل کرنا اور میری ہتک حرمت کرنا تمہارے لئے حلال ہے۔ کیا میں تمہارے نبی محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی دختر کا فرزند نہیں ہوں اور کیا میں رسولؐ کے اس وصی کا فرزند نہیں ہوں جو آنحضرتؐ کا ابن عم تھا اور جو سب سے پہلے آپؐ

پر ایمان لایا اور جس نے سب سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس امر کی تصدیق کی جسے وہ خدا کی طرف سے لائے تھے۔ کیا حمزہؓ سید الشہداء میرے باپ کے چچا نہیں ہیں اور شہید ذوالجناحین جعفر طیارؓ میرے چچا نہیں اور کیا یہ قولِ رسولؐ بمنزلۂ خبرِ مستفیض کے تم تک نہیں پہنچا جو آنحضرتؐ نے میرے بھائی کے حق میں اور خود میرے حق میں فرمایا کہ یہ دونوں سردار ہیں جوانانِ اہلِ بہشت کے"۔

ایک امام طبریؒ ہی پر موقوف نہیں ہے۔ اس پر تمام اسلامی مورخین کا اتفاق ہے کہ جناب امام حسین علیہ السلام کا موجودہ خطبہ یہانتک پہنچا تھا کہ سامعین پر کچھ ایسا عالم طاری ہوا کہ موافقین اور مخالفین غرض کُل حاضرین رو دیئے اور حضرت کی بہنیں اور بیٹیاں تو ایسے بین جگر خراش سے روئیں کہ امامؑ عالی مقام نے بیتاب ہو کر حضرت عباس علیہ السلام سے ارشاد فرمایا کہ بھائی خیمہ میں جاکر عورتوں کو سمجھادو۔

"فلما سکتن حمدالله واثنی علیه وذکرالله بما هو اهله وصلی علی محمد صلی الله علیه واله وسلم وعلیٰ ملئکته وانبیائه فذکر فان صدّقتمونی بما اقول وهو الحق والله ما تعمدت کذبا مذ علمت ان الله یمقت علیه اهله وان کذبتمونی فان فیکم من ان سالتموه عن ذلك اخبرکم سئلوا جابر ابن عبدالله الانصاری و اباسعید الخدری وسهل ابن سعد وزید ابن ارقم وانس بن مالك یخبروکم انهم سمعوا هٰذه المقالة من رسول الله لی ولاخی اما فی هذا حاجزلکم عن سفك دمی"۔

"جب مخدّرات سراپردۂ عصمت خاموش ہو گئیں تو جناب امام حسین علیہ السلام نے حمد و ثنائے ربّ العزّت اسطرح ادا کی کہ شایانِ شانِ

جنابِ کبریا تھی اور حضرت خاتم النبیین اور ملائکہ مقربین اور انبیائے مرسلینؑ پر درود بھیجا۔ پھر اپنے قدیم سلسلۂ بیان کو قائم رکھنے کی ضرورت سے حدیث سیدّ شباب اہل الجنۃ کے متعلق ارشاد فرمایا کہ اگر اس حدیث کے بیان کرنے میں تم مجھ کو سچا سمجھتے ہو تو بیشک تم نے ادراک حق کیا۔ کیونکہ میں کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔ اور میں جانتا ہوں کہ خدا جھوٹ بولنے والوں کو دشمن رکھتا ہے۔ اور اگر تم اس حدیث کے بیان کرنے میں مجھے جھوٹا سمجھتے ہو تو ابھی تم ہی لوگوں میں بہت سے ایسے لوگ زندہ ہیں جو میری راست بیانی کی تصدیق کر سکتے ہیں۔ پس تم لوگ جابرؓ بن عبداللہ انصاری، ابو سعیدؓ خدری، سہلؓ بن سعد ساعدی، زیدؓ بن ارقم اور انسؓ بن مالک سے پوچھ لو۔ وہ تم لوگوں کو بتلادینگے کہ ان لوگوں نے یہ حدیث جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبانی خود میرے اور میرے بھائی کے حق میں سنی ہے یا نہیں۔ کیا یہ بھی تمہارے لئے تم کو میری خونریزی سے روکنے کیلئے کافی نہیں ہے"۔

جب امام حسین علیہ السلام کا سلسلۂ ارشاد یہانتک پہنچا تو شمرؔ ذی الجوشن قطع سخن کر کے یکایک بول اٹھا :"انا عبدالله علی حرف ان کنت ادری ما تقول"۔ "یعنی خدا کی عبادت بر خلاف کروں اگر میں اس وقت تک یہ بھی سمجھا ہوں کہ آپ فرما کیا رہے ہیں"۔

امامؑ عالی مقام نے تو اس مایۂ ضلالت کا کچھ جواب نہ دیا مگر حضرت حبیبؔ ابن مظاہر نے کلمہ بکلمہ اس کاان الفاظ میں جواب دیا :

"والله انی لارأك تعبدالله علی سعین حرفاً وانا اشهدانك صادق ماتدری مایقول وسواس قد طبع الله علی قلبك"۔

"اے شمر! تو خدا کی ہزار شکوک ووساوس کے ساتھ عبادت کرتا ہے اور میں خود تیری اس راست گفتاری کا شاہد ہوں جیسا کہ تو نے بیان کیا کہ میں جناب امام حسین علیہ السلام کی باتوں کو مطلق نہیں سمجھتا۔ بیشک ایسا ہی ہے تو ان کی باتوں کو مطلق نہیں سمجھ سکتا۔ خدائے سبحانہٗ وتعالیٰ نے تیرے قلب پر (جہالت وضلالت کی) مہر لگادی ہے"۔

جناب امام حسین علیہ السلام نے موجودہ نزاع لفظی سے قطع نظر فرما کر پھر اپنا سلسلۂ کلام آغاز کیا:

"فقال لهم فان كنتم فى شك من هذا القول افتشكون اثرأما انى ابن بنت نبيكم؟فوالله مابين المشرق والمغرب ابن بنت نبى غيرى فيكم ولا فى غيركم ويحكم اتطلبونى بقتيل منكم قتلته اومال لكم استهلكته اوبقصاص من جراحة تأخذون منى فسكت ولا يكلّمونه فنادىٰ ياشبث ابن ربعى يا حجاراابن ابجر و يا قيس ابن الاشعث ويا يزيد ابن الحارث الم تكتبوا الى: ان قد انيعت الثّمار واخضرت الجنان وانّما تقدّم على جند لك مجنّد"۔

"اگر تم لوگوں کو میرے اس کلام میں شک ہے تو کیا میرے اس دعوے میں بھی شک ہے کہ میں تمہارے پیغمبر کی بیٹی کا بیٹا ہوں اور قسم خدا کی پورے عرب سے لیکر عجم تک تمہارے رسولؐ کا بیٹا، تم میں یا تمہارے سوا اور لوگوں میں، سوا میرے اور کوئی نہیں ہے۔ افسوس ہے تم پر کیا تم یہ کہہ سکتے ہو کہ میں نے تمہارے کسی شخص کو مارا ہے جس کے خون کا بدلہ اس وقت تم مجھ سے لینا چاہتے ہو یا میں نے تمہارا کوئی مال تلف کر دیا ہے۔ یا میں نے تم لوگوں میں سے کسی کو زخمی کیا ہے۔ یا کسی طرح کا

اور آزار پہنچایا ہے جس کیلئے تم اِس وقت مجھ سے قصاص کے طلبگار ہو ؟
اتنا ارشاد فرما کر آپ رُک گئے اور تھوڑی دیر تک انتظار کرتے رہے کہ گروہِ اشقیا میں سے شائد کوئی جواب دے۔ مگر ان میں سے کسی ایک نے بھی حضرت کے کلامِ صداقت التام کا کوئی جواب نہ دیا۔ تب آپؑ نے بآوازبلند پکارا کہ :

اے شبثؔ ابن ربعی ' اے ابجر ' اے قیس ابن اشعث ' اے یزیدؔ ابن حارث ' آیا تم وہ لوگ نہیں ہو جنہوں نے مجھ کو متواتر ان لفظوں میں خط لکھ لکھ کر بلوایا کہ ہمارے درختوں کے میوے پختہ ہوگئے ہیں اور ہمارے نخلستان سرسبز و شاداب ہوگئے ہیں ۔ آپ بعجلت تمام ہمارے پاس تشریف لائیے۔ ہم لوگوں نے لشکر تیار کر رکھے ہیں"۔

سب تو خاموش رہے مگر شبث ابن ربعی نے کہا کہ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپؑ کیا کہتے ہیں۔ فی الحال آپؑ کو اپنے ابن عم یزیدؔ ابن معاویہ کی دعوت قبول کرنی ہوگی اور وہ آپ کے ساتھ برفق ومدارات پیش آئیگا۔ اس کی تقریر کے جواب میں امامؑ عالی مقام نے جواب دیا :

"لا واللہ لا اعطیکم بیدی اعطآء الذلیل ولا اقرلکم اقرار العبید ثم نادی یا عباداللہ انی عذت بربی وربکم ان ترجمون واعوذ بربی وربکم من کل متکبر لایو من بیوم الحساب"۔

"قسم خدا کی میں بطور ذلت اپنا ہاتھ کسی کے ہاتھ پر نہ دھرونگا اور نہ تم لوگوں کے سامنے غلاموں کا سا اقرار کرنے کی عار گوارا کرونگا۔ یقیناً میں نے تمہارے اور اپنے پروردگار سے پناہ مانگی ہے کہ تم مجھے سنگسار کر سکو اور میں اپنے اور تمہارے پروردگار کی پناہ مانگتا ہوں ایسے لوگوں کے شر سے محفوظ رہنے کیلئے جو اپنے غرور کی وجہ سے روز قیامت پر یقین نہیں رکھتے"۔

اتنا فرما کر آپؑ نے پھر عقبہ ابن سمعان کو بلایا اور اسکو ناقہ کی مہار دیکر آپؑ اپنے گھوڑے پر سوار ہوئے جس کا نام ناسخ التواریخ کی تحقیق میں مر تجز تھا۔ مگر عام طور سے ذوالجناح مشہور ہے۔ اس کے بعد امامؑ عالی مقام اپنے چند اصحابِ باوفا کے ساتھ عمر سعد کے لشکر کے اور قریب آگئے تو بریر ابن خضیر ہمدانی نے آگے بڑھ کر اپنے مخصوص اہلِ کوفہ کو مخاطب کر کے باآواز بلند پکارا اور کہا :

"یقوم اتقوالله فان ثقل محمد صلی الله علیه واله وسلم قد اصبح بین اظهر کم هٰؤلآء ذرّیته وعترته وبناته وحرمه فها تواما عندکم وماالذی یریدون ان تصغوابهم"۔

"اے قوم! خدا سے ڈرو اور اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وصیّت یاد کرو کہ آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا تھا کہ :"انی تارك فیکم الثقلین کتاب الله وعترتی "وہ ثقل محمدؐ یہی ہے جو تمہارے سامنے موجود ہے اور اس کی ہمراہی میں اسکے لڑکے لڑکیاں، عترت اور اس کے حرم محترم ہیں۔ اب تم کھل کھل کر بیان کرو کہ ایسے لوگوں کے ساتھ تمہارا کیا ارادہ ہے۔ اور ان لوگوں کے ساتھ تم کس طرح پیش آنا چاہتے ہو ؟

"افلا تقبلون منهم ان یرجعوا الی المکان الذی جآء ومنه ویلکم یا اهل الکوفة انسیتم کتبکم وعهودکم التی اعطیتموها واشهد تم الله علیها ویلکم ادعوتم اذعرفتم اهل بیت نبیکم وزعمتم انکم تقتلون انفسکم دونهم اذا اتوکم اسلمتموهم الی ابن زیاد ومتعتموهم عن مآء الفرات بئس ماخلفتم ببنیکم فی ذریته مالکم لا سقاکم الله یوم القیٰمة"۔

"آیا تم لوگوں کو منظور نہیں ہے کہ یہ جماعت وہاں لوٹ جائے جہاں سے

آئی ہے۔ کیوں اہل کوفہ کیا تم نے اپنے لکھے ہوئے خطوط کو اور ان وعدوں کو جن پر تم نے خدا کو درمیان دیا تھا اور جن میں تم نے واضح طور پر یہ لکھا تھا کہ اہل بیتؑ پیغمبرؐ تمہارے پاس آئیں تو تم انکی نصرت و متابعت میں اپنی جانیں نثار کر دو گے' بالکل فراموش کر دیا۔ اب جب وہ لوگ تمہارے پاس آگئے تو تم ان لوگوں کو ابن زیاد کے حوالے کئے دیتے ہو اور فرات کے پانی کو ان پر بند کئے بیٹھے ہو۔ واقعی تم اپنے پیغمبرؐ کے بدترین پیرو ہو کہ انکی ذریّت طاہرہ کے ساتھ ایسے سلوک کرتے ہو۔ خدائے سبحانہ تعالیٰ بروز قیامت تم کو کبھی سیراب نہ فرمائے"۔

بریرؓ کا یہ کلام سن کر گروہِ اشقیا نے پھر وہی اپنا معمولی جواب دیا کہ نہیں سمجھتے تم کیا کہتے ہو؟ بریرؓ نے کہا:

" الحمدلله الذی ذادنی فیکم بصیرة اللهم انی ابرء الیك من افعال هؤلآء القوم اللّٰهم الق بأسهم بینهم حتی یلقوك وانت علیهم غضبان"۔

"اس خدائے سبحانہ وتعالیٰ کا شکر ہے جس نے بمقابلہ تم لوگوں کے مجھ کو دیدۂ بصیرت عطا فرمایا۔ پروردگار! میں اس قوم کے افعال سے بالکل بیزار ہوں۔ پروردگار! اس جماعتِ شقاوتِ اثر کو آپس میں ٹکرا دیجئو کہ ایسی حالت میں تیرے حضور پہنچیں کہ تو ان پر غضبناک ہو"۔

یہ کلام سن کر کوفیوں نے بریرؓ پر تیر چلائے۔ بریرؓ جنابِ امام حسینؑ کے پاس چلے آئے۔ اگرچہ صفوفِ مخالفین کے تیر آتے ملاحظہ فرمائے مگر وہ ہادی برحق اپنی جگہ سے نہ ہٹا۔ بلکہ کوفیوں کے تیر اندازوں کے سامنے پھر دوسرے خطبہ کا آغاز فرمایا۔

امامِ عالی مقام کا دوسرا خطبہ

"انشدکم هل تعرفوننی قالوا نعم انت ابن رسول الله صلی الله

علیه واله وسلم ومن سبطیه قال انشدکم بالله هل تعلمون ان امی فاطمة بنت محمد صلی الله علیه واله وسلم قالوا نعم فقال انشدکم بالله هل تعلمون ان ابی علیؑ ابن ابیطالب قالوا نعم قال انشدکم بالله هل تعلمون ان جدّتی خدیجة بنت خویلد اول نسآء هٰذه الامة قالوا اللهم نعم قال انشدکم بالله هل تعلمون انّ حمزة سیدّالشهدآء عم ابی قالوا اللهم نعم فقال انشدکم بالله هل تعلمون انّ جعفرالطّیاّر فی الجنة عمّی قالوا اللهم نعم قال انشدکم بالله هل تعلمون انّ هٰذا سیف رسول الله صلی الله علیه واله وسلم وانا مقلّد بها قالوا اللهم نعم قال انشدکم بالله هل تعلمون ان هذه عمامة رسول الله صلی الله علیه واله وسلم انا لا لابسها قالوا اللهم نعم قال انشد بالله هل تعلمون ان علیاًؑ کان اوّلهم اسلاما واعلمهم علماً وّاعظمهم حلما وانّه ولیّ کلّ مؤمن ومؤمنة قالوا اللهم نعم فقال اتستعجلون دمی وابی صلوات الله علیه الفائد عن الحوض یذودعنه رجالا کمایذاد البعیر الصّادر عن المآء ولوآء الحمد فی ید ابی یوم القیٰمة قالوا قد علمنا ذلك کلّه ونحن غیرتارکیك حتی یذوق الموت عطشا“۔

”یعنی میں تم کو خدا کی قسم دیتا ہوں آیا تم مجھ کو پہچانتے ہو؟۔ سب نے کہا ہم کیونکر آپؑ کو نہ پہچانینگے ۔ آپؑ ہمارے رسولؐ کے فرزند ہیں اور نواسے۔ امامؑ نے فرمایا تم کو خدا کی قسم آیا تم جانتے ہو کہ میری ماں فاطمہؑ بنت محمد مصطفیؐ ہے۔ سب نے کہا ہاں۔ امامؑ نے فرمایا تم کو خدا کی قسم تم جانتے ہو کہ علیؑ بن ابیطالبؑ میرے باپ ہیں؟ سب نے کہا ہاں۔ امامؑ

نے کہا تم کو خدا کی قسم آیا تم جانتے ہو کہ جنابِ خدیجہ بنت خویلد میری نانی ہیں جو اس امت کی پہلی عورت ہیں۔ سب نے کہا ہاں۔ امامؑ نے فرمایا تم کو خدا کی قسم آیا تم جانتے ہو کہ حمزہ سید الشہداء میرے باپ کے چچا تھے۔ سب نے کہا ہاں۔ امامؑ نے فرمایا تم کو قسم خدا کی آیا تم جانتے ہو کہ جعفر جو ریاض جنت میں دو شہپروں کے ذریعہ سے پرواز کرتے ہیں وہ میرے ہی چچا تھے۔ سب نے کہا ہاں۔ امامؑ نے فرمایا آیا تم جانتے ہو کہ یہ شمشیر جناب رسولؐ خدا کی ہے جو میں حمائل کئے ہوں۔ سب نے کہا ہاں۔ امامؑ نے فرمایا آیا تم جانتے ہو کہ یہ عمامۂ جنابِ رسولؐ ہے جو میں باندھے ہوں۔ سب نے کہا ہاں۔ امامؑ نے فرمایا آیا تم جانتے ہو کہ میرے پدر بزرگوار ایسے بزرگ ہیں جو سب سے پہلے ایمان لائے اور جو بلحاظ علم و حلم کے تمام اہل اسلام سے زیادہ فضیلت رکھتے ہیں اور وہ تمام مؤمنین و مؤمنات کے مولا ہیں۔ سب نے کہا ہاں۔ ہم جانتے ہیں۔ امامؑ نے فرمایا کہ جب تم کو یہ سب کچھ معلوم ہے تو پھر تم کیوں میرے خون کو مباح سمجھتے ہو۔ حالانکہ تم خوب جانتے ہو کہ فردائے قیامت میں میرے ہی والدِ بزرگوار تمام تشنگانِ اُمت کو حوضِ کوثر پر اس طرح لیجائیں گے جس طرح شتربان اپنے اونٹوں کو مشرع آب پر پانی پلانے کی غرض سے لیجاتے ہیں اور بہت سوں کو وہاں سے اسطرح ہٹادینگے جس طرح غیر اونٹوں کو ہٹا دیا کرتے ہیں اور اُس دن لوائے حمد میرے ہی پدر بزرگوار کے ہاتھ میں ہوگا۔ ان لوگوں نے جناب امام حسینؑ کی تقریر سن کر جواب دیا کہ ہم لوگوں کو یہ سب باتیں معلوم تو ہیں مگر بااین ہمہ ہم لوگ آپؑ سے ہاتھ نہیں اُٹھائیں گے۔ جب تک کہ آپؑ اپنے

ہونٹوں سے شربتِ مرگ کا جام نوش نہ فرمائیں"۔(ناسخ التواریخ صفحہ ۲۵۱ مقتل ابواسحٰق صفحہ ۳۵)

جناب امام حسین علیہ السلام کا یہ دوسرا خطبہ تھا۔ ابھی اور خطبات بھی باقی ہیں جو عنقریب اپنے اپنے مقام پر سلسلۂ بیان میں آتے جائیں گے۔ علامۂ ابواسحٰق اور ناسخ التواریخ کے ذی قدر مؤلف بیان کرتے ہیں کہ اس خطبہ کو تمام فرما کر امامؑ عالی مقام خیمۂ مطہر میں تشریف لائے۔ حضرت زینبؑ خاتون حاضر خدمت ہوئیں ارشاد ہوا کہ سب اہل بیتؑ کو جمع کرو۔ سب حاضرِ خدمت ہوئے تو ان گرفتارانِ مصیبت نے خود پوچھا کہ ہم کیوں طلب کئے گئے ہیں؟ امامؑ عالی مقام نے آبدیدہ ہو کر ارشاد فرمایا:

"حاجتی اوصیکن اذا انا قتلت فلاتشققن علی جیباوّلاتلطمنّ علی خدًا ولا تخدشن علیّ وجھا"۔

"یعنی تم سے صرف اس وصیت کی ضرورت ہے کہ میں جس وقت مارا جاؤں۔ میرے ماتم میں تم گریباں چاک نہ کرنا۔ اپنے منہ پر طمانچے نہ مارنا۔ اور اپنے رخساروں کو مجروح نہ کرنا"۔

اس کے جواب میں جناب زینبؑ نے عرض کی کہ آپؑ تو اس وقت ایسی باتیں فرماتے ہیں جیسے آپؑ کو اپنی موت کا بالکل یقین ہو چکا ہو۔ فرمایا ہاں ایسا ہی ہے۔ اتنا سننا تھا کہ جنابِ زینبؑ نے رو رو کر فرمایا:

"واثکلاہ وامحمداہ واعلیّاہ واحسناہ واضعفاہ واغربتاہ واقلۃ ناصراہ فقال لہا الحسین علیہ السلام یااختی تعزی بعزاء اللہ فکان سکان السموات یفنون واھل الارض یموتون ولا یبقی الا اللہ فلا تذھبی بحلمک الشیطان"۔

"ان کے نالہ و فریاد سن کر امامؑ علی مقام نے ارشاد فرمایا کہ اے بہن صبر کرو۔
ساکنین آسمان بھی فنا ہونے والے ہیں اور قائین ارض بھی مرنیوالے ہیں۔
خدائے سبحانہ وتعالیٰ کی ذاتِ پاک کے سوا اور کوئی رہنے والا نہیں ہے۔
خبردار رہو۔ شیطان تمہارے حلم کو بدنمانہ کرنے پائے"۔

یہ ارشاد سنکر جناب زینب علیہا السلام نے اپنے دیدۂ اشکبار سے آنسو پونچھ ڈالے۔ مگر عجیب مضطربانہ لہجہ میں اپنے غریب بھائی سے پوچھا کہ آپؑ ہم کو یہاں سے نکال کر اور کہیں لیجائیں تب تو آپ کی جان سلامت بچیگی؟ جناب امام حسینؑ نے فرمایا :لو ترك القطام لنام۔ یہ جملہ فرما کر آپؑ نے اسی مقام پر ایک لمحہ استراحت فرمایا اسی عرصہ میں کچھ غنودگی سی آپؑ پر چھاگئی۔ آنکھ کھولی تو جناب زینبؑ سے فرمایا :رایت الساعة جدی رسول الله صلی الله علیه واله وسلم وهو يقول یابنی اصبر الساعة تاتی الینا "۔ میں نے جناب رسالتماب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے جدبزرگوار کو ابھی خواب میں دیکھا۔ آپؐ فرماتے تھے کہ اے میرے فرزند تھوڑی دیر اور صبر کرلے اس کے بعد تو ہمارے پاس پہنچا چاہتا ہے"۔

اہل حرم میں تو امام علیہ السلام کے اس خواب کو سن کر کہرام مچ گیا اور آپؑ ان کو تسکین و تشفی فرما کر باہر تشریف لائے۔ زہیر ابن القین نے اسی اثنا میں صف سے بڑھکر مخالفین کو مخاطب کیا اور کہا:

"ایهاالناس! ان حق المسلم علی السلم النصیحة ونحن وانتم علیٰ دین واحد وقد ابتلانا الله بذرّیّة رسول الله صلی الله علیه واله وسلم لینظر مانحن وانتم صاحبون وانا ادعوكم الیٰ نصرته وخذلان الطغاة"۔

"ایہاالناس! ایک مسلمان کا فرض ہے کہ وہ دوسرے مسلمان کو نصیحت

کرے۔ چونکہ ہم اور تم ایک طریقہ پر اور ایک شریعت پر ہیں۔ اس لئے ہم تم کو آگاہ کئے دیتے ہیں کہ اس وقت خدائے سبحانہ وتعالیٰ اپنے رسولؐ کے فرزند کی نصرت کے متعلق ہمارا اور تمہارا امتحان لے رہا ہے اور یہ بھی دیکھنا چاہتا ہے کہ اسکی نصرت وحمایت پر کون کون آمادہ و مستعد رہتا ہے اور اس سے کون پہلو تہی کرتا ہے۔ پس میں تم کو نصرت حسینؑ کی طرف دعوت اور اہل ضلالت کی ترک رفاقت کی ہدایت کرتا ہوں"۔

زہیرؓ کی یہ تقریر سن کر کوفیوں نے جواب دیا کہ ہم تو تمہارے رئیس جماعت کو ضرور قتل کرینگے تاوقتیکہ وہ بیعتِ یزید اختیار نہ فرمائیں۔ زہیرؓ ابن القین نے جواب دیا کہ یارو آنکھیں کھولکر دیکھو جناب امام حسینؑ تمہاری عقیدت اور حمایت کے زیادہ مستحق ہیں یا یزید اور ابن زیاد وغیرہ؟ اگر تم انکی نصرت وحمایت نہیں کرتے ہو تو انکی دل آزاری بھی نہ کرو اور اس سے ہاتھ اٹھالو۔ ہو سکتا ہے کہ قتل کے بغیر خود یزید جناب امام حسینؑ سے راضی ہو جائے اور ایسی حالت میں وہ تم سے بھی رضامند رہے گا۔ زہیرؓ کا سلسلۂ کلام جب یہانتک پہنچا تو یکایک شمر نے زہیرؓ کو ایک تیر لگا کر یہ کہا کہ کہاں تک اِن طول کلامیوں سے اپنی زبان کو بیکار تھکاتا رہے گا۔ زہیرؓ نے جواب دیا کہ تو جانور لایعقل ہے' انسان نہیں ہے اور تیرا ٹھکانا سوائے جہنم کے اور کہیں ہونیوالا نہیں ہے اور تو ہمیشہ عذاب الیم میں گرفتار رہیگا۔ شمر نے کہا کہ میں تجھ کو بھی مارونگا اور تیرے آقا کو بھی قتل کرونگا۔ زہیرؓ نے جواب دیا کہ تو مجھ کو قتل سے ڈراتا ہے۔ مجھ کو تو رفاقتِ حسینؑ میں مرنا اس جینے سے بدرجہا بہتر معلوم ہوتا ہے اس تقریر کے بعد زہیرؓ ابن القین نے اپنے اصحاب کو مخاطب کر کے کہا:

"معاشر المهاجرين والانصار لا يغركم كلام هذا الكلب

الملعون واشباهه فانه لا ينال شفاعة محمد صلى الله عليه واله و سلم ان قوما قتلوا ذريّته وقتلوا من نصرهم فانهم فى جهنم خالدون ابدا"۔

"اے گروہ مہاجرین وانصار کہیں اس سگ ملعون کا کلام تم کو فریب نہ دے کیونکہ یہ وہ ہے جس کو جناب محمدؐ کی شفاعت کبھی نصیب ہونیوالی نہیں ہے۔ کیونکہ یہ قوم شقاوت اثر وہی ہے جو ذریّت رسولؐ کو اور ان لوگوں کو جو اسکی نصرت کرتے ہیں قتل کریگی اور یہ قوم وہی ہے جو ہمیشہ کیلئے دوزخ میں رہیگی"۔

یہ حال ملاحظہ فرما کر جناب امام حسینؑ نے ایک صحابی کی معرفت زہیرؓ ابن القین کے پاس کہلا بھیجا کہ تم نے انکی مواعظت کا حق ادا کر دیا اور انکو صلاح نیک دیدی۔ یہ کہلا کر جناب امام حسینؑ بنفس نفیس خود گروہ اشقیا کی طرف مخاطب ہو کر ارشاد فرمانے لگے :

"يا ايها الناس اعلموا ان الدنيا دارفنآء وزوال منصرّفةً باهلها من حال الىٰ حال معشرالناس عرفتم شرائع الاسلام وقرأتم القراٰن وعلّمتم ان محمدا رسول الله الملك الديّان وثبتم على قتل ولده ظلماً وعدواناً معشرالناس اماترون الى مآء الفرات يلوح كانه بطوت الحيات يشربه اليهود والنصارىٰ والكلاب والخنازير وآل رسول الله صلى الله عليه واله وسلم يموتون عطشا"۔

"لوگو یقین کر لو کہ دنیا محل فنا وزوال ہے اور ساعت بساعت اس کے رہنے والے ایک حال سے دوسرے حال پر متغیر ہوتے رہتے ہیں۔ تم اسلام کے طریقے پر ہو اور کتاب الٰہی کی تلاوت کرتے ہو اور محمد مصطفیؐ

کو خدا کا رسول جانتے ہو۔ بااین ہمہ اس کی اولاد کو عداوت کی راہ سے قتل کرنے پر تلے ہوئے ہو۔ کیا تم نہیں دیکھ رہے ہو کہ آبِ فرات جو سانپ کی طرح لہریں مار رہا ہے اس سے یہود و نصاریٰ کیا سور اور کتے تک تو سیراب ہو رہے ہیں مگر اولادِ رسولؐ اللہ پیاس سے مرے جا رہے ہیں"۔

امامؑ عالی مقام کا یہ کلام سن کر ان اشقیا نے جواب دیا کہ باتیں کم کیجئے۔ آپ کو اور آپ کے ہمراہیوں کو اس میں سے ایک قطرہ بھی نہیں مل سکتا۔ یہانتک کہ آپؑ اور آپ کے تمام ہمراہی ایک کے بعد ایک پیاس کی تکلیفیں اٹھا کر جام مرگ نوش فرمائیں۔ ان بے رحموں کے یہ گستاخانہ جواب سن کر امام علیہ السلام نے ذیل کا آیہ تلاوت فرمایا:

"ان القوم الستحوذ علیهم الشیطٰن فانسهم ذکر الله اولئك حزب الشیطٰن الا ان حزب الشیطن هم الخاسرون"۔

"شیطان اس جماعت پر غالب آگیا ہے اور ذکر خدا کو اسنے ان لوگوں کے دل سے بھلا دیا ہے یہ جماعت شیطانی لشکر ہے اور شیطانی لشکر ضرور گھاٹا اٹھانیوالا ہے"۔ اس کے بعد آپؑ نے ذیل کے اشعار پڑھے۔

لعذبتم یاشر قم ببغیکم   وخالفتموا فینا البنی محمداً

اما کان حلّی خیرة الله احمداً

اما کانت الزهرآء امی و والدی   علیؑ اخاخیرالانام السمدّذا

لعنتم واخزیتم قدنسیتم   ستصلون ناراً حرّها قد توقدا

"اے بدترین قوم! تم پر تمہاری بغاوت کے جرم میں عذاب ہوگا کہ تم نے جناب محمد مصطفیٰؐ کی جو ہمارے بارے میں فرما گئے تھے مخالفت کی۔ کیا اس بہترین خلق نے ہمارے لئے وصیت نہیں فرمائی تھی؟ کیا ہمارے

جدبزرگوار احمد مجتبیؐ برگزیدۂ خدا نہیں ہیں۔ کیا فاطمۃ الزہراء سلام اللہ علیہا ہماری مادر گرامی قدر نہیں ہیں ؟ کیا ہمارے والدبزرگوار علی مرتضیٰؑ نہیں ہیں جو جناب خیرالانام کے بھائی ہیں ؟ پس لعنت اور ذلت ہو تم لوگوں پر کہ تم نے سب کچھ بھلادیا۔ عنقریب تم نار دوزخ میں جاؤ گے جس کے شعلے ہمیشہ کیلئے مشتعل ہونگے"۔

ان اشعار کے بعد آپؑ نے ذیل کا خطبہ ارشاد فرمایا۔

امامؑ عالی مقام کا تیسرا خطبہ :

"فقال الحمدلله الذی خلق الدنیا فجعلها دارفنآء وّزوال متصرفة باهلها حالابعدحال فالمغرور من غرّته والشقی من فتنة فلا تغرنّکم هذه الدنیا فانها تقطع رجآء من رکذالیها وتخیب من طمع فیها واراکم قداجتمعتم علی امرقداسخطتم الله فیه علیکم و اعرض بوجه الکریم عنکم واحل بکم نقمته و جنّبکم رحمته فنعم الرّب ربّنا وبئس العبید انتم اقررتم بالطاعة وامنتم بالرّسول محمد صلی الله علیه واله وسلم ثم انکم رجفتم الی ذریّته وعترته تریدون قتلهم لقد استحوذعلیکم الشیّطن فانسکم ذکرالله العظیم فتبّا لمآتریدون انا لله وانآ الیه راجعون هٰؤلآء قوم کفروا بعد ایمانهم فبعداللقوم الظٰلمین"۔

"میں خدا کی تعریف کرتا ہوں جس نے دنیا کو پیدا کیا اور اس کو دارِ فنا وزوال پذیر قرار دیا اور اس کے باشندوں کو ایک حالت سے دوسری حالت میں اور ایک صورت سے دوسری صورت میں بدل جانے والا پیدا کیا۔ پس مغرور وہی شخص ہے جو دنیا پر شفتہ ہو جائے اور شقی وہی شخص

ہے جو دنیا کا عاشق ہو۔ ایہاالناس! دنیا کے مکروفریب میں نہ آؤ۔ کیونکہ دنیا اس شخص کی تمام امیدوں کو قطع کرڈالتی ہے جو اسکی طرف رغبت کرتا ہے اور جو اس سے امید رکھتا ہے اسی کو ناکام کردیتی ہے اور اب میں دیکھتا ہوں کہ جس امر پر تم لوگوں نے اتفاق کیا ہے وہ خدائے سبحانہ' و تعالیٰ کی ناراضی کا سبب ہے اور وہ اس وجہ سے تم لوگوں سے اپنامُنہ پھیر لیگا۔ اور اپنا عذاب تم پر نازل فرمائے گا اور اپنی رحمت کو تم لوگوں سے دور کردیگا۔ دیکھو خداوند عالم کیسا اچھا پروردگار ومالک ہے اور تم لوگ اسکے کیسے برے بندے ہو کہ تم نے اسکی رسالت وشریعت کی تصدیق کی اور اس پر ایمان لائے اور اسکے رسول محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت کی تصدیق کی۔ اب اسی کے اہل بیت پر فوج کشی کررہے ہو اور انکے قتل پر مستعد ہو۔ اسی وجہ سے شیطان تم پر غالب آگیا ہے اور اس نے تم کو ذکر خدا سے باز رکھا ہے۔ پس تم کو ہلاکت نصیب ہو۔ یہ کیاارادہ تم نے کیا ہے۔ اناللہ واناالیہ راجعون۔ یہ وہی قوم ہے جو بعد ایمان لانے کے کافر ہو گئی۔ پس اس قوم ظالمین پر لعنت ابدی ہو"۔

جناب امام حسین علیہ السلام کا ایسامؤثر خطبہ سن کر عمر سعد کے کان کھڑے ہوئے۔ سوچا کہ اگر آپکے کلام صداقت التیام نے اس فوج پر اثر کیا تو بُرا ہو جائے گا۔ اس نے فوراً فوج کو للکار کر آواز دی کہ تم جناب امام حسینؑ کے جواب دینے کی کوشش نہ کرو۔ یہ سمجھ لو کہ حسینؑ امیر المومنین علیؑ ابن ابیطالبؑ کا بیٹا ہے۔ آج پر موقوف نہیں اگر کل تک تم اس سے یونہی گفتگو میں مصروف رہو گے تو وہ برابر ایسی ہی مسلسل تقریر کرتا رہیگا اور اسکی زبان تمہارے جوابوں سے ہر گز بند نہ ہو گی۔

اس کے بعد شمر ذی الجوشن جرأت کر کے آگے بڑھا اور کہنے لگا یا حسینؑ جو

کچھ تعلیم کرنا ہو وہ مجھے تعلیم فرمائیے۔ آپؑ نے ارشاد فرمایا:

"اقول اتقوالله ربکم ولا تقتلونی فانه لا یحل لکم قتلی ولا انتهاك حرمتی فانِ انا ابن بنت نبیکم وجدتی خدیجة زوجة نبیّکم ولعلّه بلّغکم قول نبیکم الحسنؑ والحسینؑ سیدا الشباب اهل الجنة"۔

"یعنی میں تو یہی کہتا ہوں کہ خدا سے ڈرو اور مجھے قتل نہ کرو۔ کیونکہ میرا قتل تم پر حلال نہیں ہے اور میری حرمت ضائع کرنا تمہیں جائز نہیں کیونکہ میں تمہارے رسولؐ کی بیٹی کا بیٹا ہوں۔ اور میری جدّۂ ماجدہ خدیجہؓ جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زوجۂ محترمہ ہیں اور تم نے سنا ہوگا کہ جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ حسن و حسین علیہما السلام دونوں جوانانِ بہشت کے سردار ہیں"۔

شمر تو یہ سنکر دم بخود ہو رہا مگر ابنِ سعد نے تمام لشکر کو حکم دیا کہ اب جناب امام حسینؑ کو زیادہ تقریر کی فرصت نہ دو چاروں طرف سے محاصرہ کرلو۔ حکم کی دیر تھی۔ اہل کوفہ و شام نے چاروں طرف سے سمٹ کر امامؑ عالی مقام کو اپنے حلقہ میں لے لیا۔ مگر اس حجۃ اللہ بر حق اور اس داعی الی کلمۃ المطلق کے استقلال کی کہانتک تعریف کیجائے۔ جس نے اپنے فرائض ہدایت کی ادائیگی کے مقابلہ میں ایسے شدید محاصرہ کی کچھ پرواہ نہیں کی۔ اور اتمام حجت کی ضرورت سے ان بے دینوں کو ڈانٹ کر کہا:

"ویلکم ماعلیکم ان تنصتوا الی فاسمعوا قولی وانما ادعوکم الیٰ سبیل الرشاد فمن اطاعنی کان من المرشدین و من عصانی کان من المهلکین و کلکم عاص لامری غیر مستمع قولی فقد ملئت بطونکم من الحرام وطبع علیٰ قلوبکم ویلکم الا تنصتون الا تسمعون"۔

"تم لوگوں کو ہو کیا گیا ہے کہ تم میری بات تک نہیں سنتے۔ حالانکہ میں تم کو راہ راست کی طرف بلا رہا ہوں اور میری دلی خواہش یہ ہے کہ جو شخص میری اطاعت کرے وہ سعادت ور شادت حاصل کریگا اور جو شخص میرے مقابلہ میں معاصی کا مرتکب ہو گا وہ اپنی ہلاکت کا باعث ہو گا۔ پس تم لوگ میری باتیں نہ سننے کی وجہ سے سخت معاصی میں گرفتار ہوتے ہو اور اسکی وجہ یہ ہے کہ تمہارے شکم مالِ حرام سے پر ہیں اور تمہارے دلوں پر ظلمت کی سخت مہر لگی ہوئی ہے۔ کیا تم غور نہیں کرتے؟ کیا تم میری باتوں کو نہیں سنتے"۔

جناب امام حسینؑ کی یہ تقریر سن کر عمر سعد کی فوج میں ایک دوسرے کو خود امامؑ عالی مقام کی طرف مخاطب کرنے لگا جب وہ سب امامؑ کی طرف مخاطب ہو گئے تو یہ دیکھ کر جناب امام حسینؑ نے ذیل کا خطبہ ارشاد فرمایا جو اپنی فصاحت وبلاغت کے اعتبار سے اپنا جواب آپ ہی ہے۔

"تبّالکم ایها الجماعة وترحاً افحين استصرختمونا ولهين متحيّرين فاصرخناكم موجفين 'فشحذتم علينا سيفا فی رقابنا و حمّشتم علينا ناراً اضرمناهاعلى عدوّكم وعدوّنا فاصبحتم البأ علىٰ اوليآئكُم ويداً على اعدآئكم بغير عدل افشوه فيكم ولا امل اصبح لكم فيهم الا الحرام من الدنيا انا لوكم وخسيس عيش طمعتم فيه من غير حدث كان منّا ورأى تفيّل لنا فهلّا لكم الويلات اذ كرهتمونا و تركتمونا وتجهّزتمونا والسيف لم يشهر والجاش طامن والارای لمايستحصف ولكن كم اسرعتم الى بيعتنا كطيرة الدّبا وتداعيتم اليها كتداعى الفراش فَقُبحاً لّكم فانّما

انتم من طواغیت الامّة وشذّاذ الاحزاب ونبذة الکتاب و نفثة الشیطٰن و عصبة الاثام ومحرّفی الکتاب و مطفئ السّنن وقتلة اولاد الانبیآء ومبیری عترة الاوصیآء وملحقی العهاد بالنّسب ومؤذی المؤمنین وصراخ ائمّة المستهزئین الذین جعلوا القران عضین و انتم علی ابن حرب واشیاعه تعتمدون وایّانا تخاذلون اجل والله الخذل فیکم معروف وشجت علیه عروقکم و توادثته اصولکم و فروعکم وثبتت علیه قروبکم وغشیت صدورکم فکنتم اخبث شئ سنخاً لّلنّاصب واکلةً للّغاصب الالعنة الله علی الناکثین الّذین ینقضون الایمان بعد توکیدها وقد جعلتم الله علیکم کفیلا الا انّ الدّعیّ ابن الدّعیّ قدرکزبین اثنتین بین السّلّة والذّلّة وهیهات مناالذلّة ابی الله ذلك ورسوله وجدود طابت و حجور طهرت وانوت حمّیة ونفوس ابیةً لا توثرمصارع اللّئام علی مصارع الکرام الا قد اعذرت وانذرت الا انّی زاحف بهٰذه الاسرة علی قلّة الاعوان وخذلة الاصحاب“۔

”اے جماعت شقاوت اثر تم لوگوں کو ہلاکت وذلت نصیب ہو۔ تم نے خود سرگشتہ وحیران ہو کر ہم سے فریاد کی اور ہم تمہاری فریاد سننے کیلئے اور تم کو مدد ' دینے کیلئے آمادہ و مستعد ہوئے۔ اب تم نے ہمارے منہ پر تلواریں کھینچ لیں اور تم نے اس فتنہ کی آگ بھڑکائی جو ہمارے اور تمہارے دشمن نے پیدا کیا ہے۔ پس تم لوگ اپنے دشمنوں کی باتوں میں آکر اپنے دوستوں کی عداوت ومخالفت پر مستعد ہو گئے بغیر اس کے کہ ان کا انصاف تم پر ظاہر ہوا ہو یا کوئی امید انہوں نے تم کو دلائی ہو۔

سوائے اِس کے کہ تم نے حرام دنیا کو حاصل کیا اور ذلیل ترین زندگانی دنیا کی آرزو کی حالانکہ تمہارے لئے ہماری طرف سے کوئی بُرائی ظاہر نہیں ہوئی اور نہ ہم نے تمہارے ادائے حقوق میں کوئی خطا کی۔ پس ایسی حالت میں تم کیونکر گرفتار عذاب نہ ہوگے کہ تم نے ہم سے نفرت کی۔ ہم کو چھوڑ دیا اور لشکر ہماری مخالفت میں جمع کر لئے۔ حالانکہ ہماری تلواریں نیام کے اندر ہیں اور ہمارے دل ابھی تک تمہاری طرف سے مطمئن ہیں اور ہمارے خیالات خدشات سے بالکل خالی ہیں مگر تم ان مخالفانہ کاروائیوں میں جلدی کر رہے ہو اور جمع ہو کر اپنی متفق علیہ تجویزوں سے آتش فساد کو مشتعل کرتے ہو اور اپنے آپ کو دیوانوں کی طرح اس آگ میں اوندھا سیدھا ڈالے دیتے ہو اور مثل پروانوں کے جلے جاتے ہو۔ معلوم ہوا کہ تم بقیہ احزاب گمراہان امت' منکران کتاب اور پیروان شیطان رجیم' گناہگار گروہ ہو۔ تم احکام الٰہی کی تحریف کرنیوالے اور شریعت رسالت پناہی کے مٹانیوالے اور ذریت انبیاء کے قتل کرنے والے اور عترت اوصیاء کا خون بہانیوالے ہو۔ تم وہی قوم ہو جو حرام زادوں کو اپنے حسب و نسب میں داخل کرتے ہو۔ دیندارنِ امت کو آزار پہنچاتے ہو اور خدا اور رسولؐ کی ہنسی اڑانیوالے سرداروں کے مددگار ہو' جنہوں نے قرآن کو پارہ پارہ کر دیا ہے اور تم حرب کے بیٹے اور اس کے گروہ پر بھروسہ کرتے ہو اور ہماری مدد سے دست بردار ہو گئے ہو۔ ہاں! ہاں! قسم بخدا پیمان شکنی اور بیوفائی تمہارے خاص اوصاف میں داخل ہو چکی ہے۔ اور یہ صفت تمہاری رگ و پے میں اثر کر چکی ہے اور اس نے تمہارے تمام اعضاء و جوارح پر حقوقِ توریث کی رو سے قبضہ

کرلیا ہے اور تمہارے دلوں نے اس صفتِ ذمیمہ کو نہایت استقلال واستحکام سے قبول کرلیا ہے۔ پس تم ایسی بدترین قوم ہو کہ ناصبین بھی تم کو حقیر سمجھتے ہیں۔ اور طائفہ غاصبین تم کو اپنے ایک لقمہ سے کم جانتے ہیں۔ خبردار ہو جاؤ۔ ان لوگوں پر خدا کی لعنت ہوتی ہے جو عہد و پیمان کو توڑ ڈالتے ہیں اور جو حلف و ایمان کو پس پشت ڈال دیتے ہیں۔ حالانکہ تم خدائے سبحانہ تعالیٰ کو ضامن دے چکے تھے۔ قسم بخدا وہ تم ہی ہو۔ آگاہ ہو کہ یہ زنازادہ اور زنازادہ کا بیٹا یہ خیال کرتا ہے کہ میں اسکی تہدید و تاکید سے جامۂ ذلت پہن لونگا یا تو نہیں طریقِ جنگ اختیار کرونگا۔ میں ہرگز اپنی ذلت گوارا نہیں کرونگا اور نہ خدائے سبحانہ و تعالیٰ کا اور نہ رسول مقبولؐ کا یہ منشا ہے۔ ہمارے اجداد طیبین، ہماری جداتِ طاہرات، ہماری حمیّت اور ہماری غیرت کا تقاضا یہی ہے کہ ایسی ذلت کی موت کے مقابل مصبِ شہادت کو قبول فرمائیں۔ پس میں نے اپنی حجت تم پر تمام کردی اور اپنے ہمراہیوں سے تمہارے ہمراہیوں کے ساتھ لڑونگا۔ گو یہ تھوڑے سے ہیں اور بہت سے ہم کو چھوڑ کر چلے گئے"۔

یہ فرما کر آپؑ نے چند اشعار ارشاد فرمائے جن میں سے پہلا یہ ہے:

فان تغلب فغلابون قدما وان نبهزم فغير مهزمينا

یہ اشعار پڑھ کر آپؑ نے خطبہ کے بقیہ مضامین کو تمام فرمایا اور کہا کہ:

"ثم ایم اللہ لاتلبثون بعدھا الا کریث مایرکب الفرش حتی یدور بکم دون الرحی وتقلق بکم قلق المحور ھذا عھد عھدہ الی ابی عن جدی فاجمعوا امرکم شرکائکم ثم لم یکن امرکم علیکم غمة ثم اقضوا الیّ ولا تنظرون انی توکلت علی اللہ ربی وربکم مامن دآبة

الا هو اخذٌ بناصیتها انّ ربی علی صراط مستقیم"۔

"قسم خدا کی ہمارے بعد تم لوگ دنیا میں زیادہ نہ رہو گے۔ موت کی چکی تمہارے سروں پر گھومیگی اور تم کو پامال وفنا کرڈالیگی اور میرے پدر بزرگوار نے میرے جد عالی کی زبانی اس دن اور اس واقعہ کی پوری خبر پہنچائی ہے۔ پس تم لوگ اپنے کام شروع کرو اور اپنے ہمراہیوں کو اپنا ہمدست بنالو کہ جو کچھ امر ظاہر ہونیوالا ہے وہ ظاہر ہو جائیگا۔ اب تم ہم پر حملہ کرو اور ہم کو مہلت نہ دو کیونکہ ہم نے اپنے تمام امور خدائے قادر وتوانا کے سپرد کردیئے ہیں کہ کوئی مخلوق اس کی قدرت سے باہر نہیں ہو سکتی۔ یقیناً میرا پروردگار راہ مستقیم پر استوار ہے"۔

یہ خطبہ تمام فرما کر جناب امام حسینؑ نے عمر ابن سعد کو اپنے پاس طلب کیا۔ اگر چہ اس وقت اس کو آپؑ کی خدمت میں جانا نہایت شاق گزرتا تھا تاہم وہ آپکے سامنے آیا تو آپؑ نے اسکی طرف مخاطب ہو کر ارشاد فرمایا:

"یا عمر انت تقتلنی تزعم ان یولّیك الدعی ابن الدعی بلاد الرّیّ و جرجان و الله لا تتهنّاء بذلك ابداعهد معهودا فاضج ماانت صانع فانك لا تفرج بعدی بدنیا والآخرة وکانّی براسك علیٰ قصبة قدنصب بالکوفة یترا ماه الصبیان ویتخذونه غرضابینهم"۔

"اے عمر سعد تو مجھ کو ان خواہشوں کی وجہ سے قتل کرتا ہے کہ یہ زنازادہ ابن زیاد تجھ کو ملک رے اور جرجان کی حکومت عطا کریگا۔ قسم اس خدا کی جس نے مجھے پیدا کیا ہے کہ سلطنت رَے تجھ کو نصیب نہیں ہو گی۔ تو اپنی اس بات پر قائم رہ۔ اور تیرے جو جی میں آئے وہ کر۔ لیکن یہ یقین کرلے کہ بعد میرے تجھ کو دنیا وآخرت میں کوئی حصہ ملنے والا نہیں

ہے۔ میں دیکھ رہاہوں کہ کوفہ میں تیرا سر نیزہ پر نصب ہے اور لڑکے اس پر پتھر مار رہے ہیں"۔

یہ کلمات سن کر ابن سعد کو غصہ آیا۔ جس کو وہ ایک منٹ بھی برداشت نہ کر سکااور اپنے تمام لشکر والوں کو پکار کر کہاکہ اب ایک لمحہ کیلئے دیر نہ کرواور حسینؓ اور اصحاب حسینؓ پر ایکبارگی حملہ کر کے اپنی تلواروں کے نیچے رکھ لو کہ وہ تمہارے لئے لقمہ سے زیادہ نہیں ہیں۔

حسین علیہ السلام کے ارشادات کے آئینہ میں حکومت اسلامی کے خدوخال

مقالہ نگار: جناب مفتی سید آغا جزائری (قم)

اس کرہ زمین ہی کی حکومت نہیں بلکہ سارے جہان کی حکومت وملکیت صرف اللہ کیلئے ہے۔ وللہ ملك السموات والارض (آل عمران / ۱۸۹)

یوں تو اللہ کا ارادہ تشریعی یہی ہے کہ یہ حکومت ہمیشہ "امام معصومؑ" کے ہاتھوں میں رہے اور اس نے ایسا کر کے دکھا بھی دیا تاکہ دنیا کو معلوم ہو جائے کہ مردانِ خدا ہی صحیح معنوں میں حکومت کرنا جانتے ہیں اور گرگ وانسان، شیر اور بکری کو ایک گھاٹ میں پانی پلا سکتے ہیں۔ چنانچہ اس نے بطور نمونہ حضرت نوحؑ (بعد طوفان) حضرت طالوتؑ، حضرت یوسفؑ، حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ و حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ریاست وحکومت دینی کے ساتھ ساتھ دنیوی حکومتیں بھی عطا کیں۔ لیکن چونکہ ابلیس سے اللہ نے وعدہ کیا ہے کہ اس کو بھی اپنی شطینت کے رنگ وروپ دکھانے کا موقعہ دے گا تاکہ اس ضمن میں اس کی سابقہ عبادت کا عوض بھی ادا ہو جائے اور اللہ کے مخلص بندوں کی شناخت بھی ہو جائے۔ اسی لئے ان "الٰہی حکومتوں" کے روکنے کو شیطانی حکومتیں آڑے آتی رہیں۔ انہوں نے بنی نوع انسان کے خون سے خوب ہولی کھیلی اور دل کھول

کر ظلم و ستم کے بیج بوئے۔۔

خدا بھی کچھ نہ بولا۔ اس نے بندہ کو مختار جو پیدا کیا ہے:"لا اکراہ فی الدین قد تبین الرشد من الغی" اب جبکہ لوگوں نے ظالموں ہی کو اپنی گردن پر سوار کر لیا ہے تو وہ ہی سہی۔ آخر کسی نہ کسی کو تو اس دنیا کا نظام چلانا ہے۔"و لا بد للناس من حاکم برّ او فاجر"۔

اگر لوگ نیک بدنوں کی حکومت کو قبول نہ کریں گے تو بدکاروں کا تخت حکومت پر آجانا لازمی نتیجہ ہے' یہ نظام قدرت بھی ہے اور قانون فطرت بھی۔

پھر خدا کو کوئی جلدی بھی نہیں ہے۔"والی اللہ عاقبۃ الامور"۔ (لقمان / ۲۲) جب ہر طرح کی اہر یمنی و ابلیسی و طاغوتی نظام فیل ہو جائیں گے اور ساری دنیا فیل مچانے لگے گی تو آخر میں خدا اس زمین کے وارثان حقیقی کو تخت حکومت سونپ دے گا:

"ولقد کتبنا فی الزبور من بعد الذکر ان الارض یرثھا عبادی الصالحون"۔(انبیاء / ۱۰۵)

"ہم نے قرآن کے علاوہ زبور میں بھی یہ لکھ دیا تھا کہ (آخر میں زمین کے وارث میرے نیک بندے ہوں گے"۔

لیکن یہاں پر ایک اہم سوال یہ ہوتا ہے کہ:

"ظالم اور طاغوتی حکومتیں کیا چاہتی ہیں اور عادل و لاہوتی حکومتوں کا کیا منشا ہے؟"

اس مقالہ میں ہم ارشادات امام عالی مقام حضرت امام حسین علیہ السلام کی روشنی میں اس سوال کو حل کرنے کی کوشش کریں گے۔

کون حسینؑ؟ وہ حسینؑ جن کی نہضت سے بڑھ کر دنیا میں کسی کی نہضت نہ تھی۔

یہ نہ کہئے گا کہ تم نے نہضت حسینی کو نہضت محمدیؐ سے بھی آگے بڑھادیا' نہیں' بڑھایا نہیں ہے' بڑھنے کا سوال وہاں ہوتا ہے جہاں دو چیزیں ایک دوسرے سے الگ ہوں' جبکہ واقعہ یہ ہے کہ "نہضت حسینی" تتمہ ہے "نہضت محمدیؐ" کا اور مقدمہ ہے "نہضت قائمؑ" کا "نہضت محمدیؐ"۔ "نہضت حسینی"۔ "نہضت قائمؑ" ایک "حکومت اسلامی" کا صحیح تصور پیش کرتی ہیں۔

پیغمبر اسلامؐ کس طرح کی حکومت چاہتے تھے؟

"حسنِ عقیدہ" اور "حسن عمل" انہی دونوں چیزوں کیلئے سارے رسول آئے اور آخری رسول بھی اسی غرض کی تکمیل کیلئے بھیجا گیا۔ یہی خلاصہ ہے اس دین الٰہی کا جس کیلئے ارشاد ہوتا ہے:

"ان الدین عنداللہ الاسلام"۔

(آل عمران / ۱۹)

"حسن عقیدہ" اور "حسنِ عمل" ان دونوں کا اگر تجزیہ کیجئے تو یہ پانچ اصول برآمد ہوتے ہیں:

۱۔ اس خدا کو مانیں جو واقعی خدا ہے۔

۲۔ اس نبی کو تسلیم کریں جو واقعی نبی ہے۔

۳۔ اس امام (نائب نبی) کو قبول کریں جو واقعی امام ہے۔

۴۔ اس عبادت کو بجالائیں جو واقعی عبادت ہے۔

۵۔ ان معاملات پر عمل کریں جو واقعی معاملات ہیں۔

یہ پانچ اصول نہیں ہیں بلکہ پانچ سمندر ہیں' انکو اگر ایک کوزہ میں بند کرنا چاہتے ہیں تو ایک جامع لفظ میں سمیٹ لیجئے' وہ لفظ ہے "حق" اس لفظ کے اندر سارے محاسن سمٹ کر آگئے ہیں۔

قرآن نازل ہوا ہے تو اسی لئے :

"نزل عليك الكتاب بالحق"۔

(آل عمران / ۲)

سارے رسول آئے تو اسی لئے :

"لقدجاء ت رسل ربنابالحق"۔

(اعراف / ۴۲)

ہمارا رسول آیا تو اسی لئے :

"قدجاء کم الرسول بالحق"۔

(نساء / ۱۶۹)

ملائکہ نازل ہوتے ہیں تو اسی لئے :

"ماننزل الملائكة الابالحق"

(حج / ۸)

بلکہ ذات واجب الوجود کی بھی ایک تعبیر قرآنی ہے حق :

"ذلك بأن الله هو الحق"۔

(حج / ٦)

وہ جو کچھ کہتا ہے وہ بھی حق ہوتا ہے :

"والله يقول الحق"۔

(احزاب / ۴)

پھر یہ حکومت الٰہی اور ولایت حقیقی بھی خدائے بر حق کیلئے ہے :

"هنالك الولاية لله الحق"

(کہف / ۴۵)

پیغمبر اسلامؐ نے بھی ایک ایسی حکومت کی داغ بیل ڈالی تھی جس میں ہر طرف حق کا بول بالا تھا' یعنی انسانی اقدار کی قیمت تھی' مظلوموں کی حمایت اور ظالموں کی سرکوبی تھی' معروف کی ترغیب' منکر سے بچنے کی تعلیم تھی' طاعت خالق' محبت مخلوق کی طرف ہدایت تھی' غرور وتمکنت کی وجہ سے کوئی سرفرازنہ تھا۔ امیر وفقیر کا امتیاز نہ تھا' ایک ہی لشکر میں سارے غازی' اور ایک ہی صف میں سارے نمازی دکھلائی دیتے تھے۔ یعنی خالق و مخلوق دونوں کا حق ادا ہو رہا تھا۔

یہی وہ حسین نقوش ہیں جو حسینؑ کے خطاب اور ارشادات میں جواہر آبدار کی طرح بکھرے نظر آتے ہیں۔

دربارِ ولید میں امام حسینؑ کا اظہارِ حق۔

امام حسینؑ کی باطل سے سب سے پہلی مڈبھیڑ دربارِ ولید بن عتبہ میں ہوئی جہاں اس نے آپؑ سے یہ خواہش کی کہ آپؑ یزید کی بیعت کرلیں آپؑ نے اس کا جو جواب دیا' اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حکومت الٰہی کے لئے وہ افراد مناسب ہیں جن کا رابطہ اللہ سے ہو نہ کہ وہ جو ابلیس سے مرتبط ہوں' آپؑ نے فرمایا:

"ایها الامیر انا اهل بیت النبوةؐ 'ومعدن الرسالة' ومختلف الملائکة' و معدن الرحمة ' بنا فتح الله 'وبنایختم ' ویزید رجل فاسق' شارب خمر' قاتل النفس المحترمه' معلن بالفسق' و مثلی لا یبایع مثله' ولکن نصبح وتصبحون وننظرون أینا أحق بالخلافة والبیعة"۔

"اے امیر! یقیناً ہم اہل بیت نبوتؐ ہیں' اور رسالت کا معدن ہیں' ملائکہ کی آماجگاہ' رحمت الٰہی کا ٹھکانا ہیں' ہم سے اللہ نے اس کائنات کا آغاز کیا۔ اور ہم پر ہی اس کا خاتمہ کرے گا اور یزید ایک فاسق و شرابی ونفس محترمہ کا قاتل شخص ہے جو علی الاعلان فسق وفجور کرتا ہے اور مجھ جیسا کبھی اس جیسے کی

بیعت نہیں کر سکتا، لیکن ہم بھی صبح کریں اور تم بھی صبح کرو ہم بھی نظر کریں اور تم بھی نظر کرو کہ ہم میں سے کون خلافت اور بیعت کا سزاوار ہے"۔

(مثیر الاحزان ابن نما حلی (چھٹی صدی ہجری) تاریخ اعثم کوفی ۵ / ۱۸)

حضرت کی اس گفتگو سے واضح ہوتا ہے کہ بعد رسولؐ سزاوار حکومت صرف اہل بیتِ رسولؐ ہیں اگر یزید فاسق و فاجر نہ بھی ہوتا تب بھی خلافت کی اہلیت نہیں رکھتا تھا چہ جائیکہ وہ ان خرابیوں میں بھی مبتلا تھا۔

امام حسین علیہ السلام کی وصیّت

انسان کا حقیقی کردار، اور اسکے اصلی اقدار اس کی وصیت میں نمایاں ہوتے ہیں، مدینہ سے چلتے وقت آپؑ نے جو وصیت اپنے بھائی حضرت محمد حنفیہ کو لکھ کر دی اس سے بھی پتہ چلتا ہے کہ آپ کیسی حکومت چاہتے تھے، آپ حق کی حکومت چاہتے، ایسی حکومت جس میں ہر طرف حق کی روشنی ہو:

﴿بسم الله الرحمن الرحيم﴾

هذا ماوصىٰ به الحسينؑ بن عليؑ بن ابى طالبؑ الى اخيه محمدالمعروف بابن الحنفيه ان الحسينؑ يشهد ان لا اله الا الله وحده لاشريك له و أن محمدا صلى الله عليه واله عبده ورسوله جاء بالحق من عندالحق وأن الجنة والنار حق وأن الساعة آتية لا ريب فيها وأن الله يبعث من فى القبور وانى لم اخرج اشرا ولا بطراً ولا مفسداً ولا ظالماً وانما خرجت لطلب الاصلاح فى امة جدى(ص) اريد ان آمر بالمعروف وانهىٰ عن المنكر واسير بسيرة جدّى (ص) وأبى على بن ابى طالب (ع) فمن قبلنى بقبول الحق فالله اولى بالحق ومن رد على هذا اصبر حتى يقضى

الله بینی وبین القوم بالحق وھو خیرالحاکمین وھذہ وصیتی یا اخی الیك وماتوفیق الا بالله علیه توکلت والیه انیب"۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

یہ وہ امر ہے جس کی وصیت کی حسینؑ بن علیؑ بن ابی طالبؑ نے اپنے برادر محمد عرف ابن حنفیہ کی جانب کہ حسینؑ گواہی دیتا ہے کہ خدائے وحدہ لاشریک کے سوا کوئی خدا نہیں اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کے بندے اور رسول ہیں جو حق کی طرف سے حق لے کر آئے اور یہ کہ جنت ودوزخ برحق ہیں' قیامت آ کے رہے گی' اس میں کوئی شک نہیں ہے' اور خدا قبر والوں کو اٹھائے گا اور یہ کہ میں نے جو قدم اٹھایا ہے کسی نادانی اور طغیانی کی وجہ سے نہیں' نہ میں مفسد ہوں نہ ظالم' میں نے محض اپنے جد کی امت کی اصلاح کی غرض سے یہ پیش قدمی کی ہے' میں چاہتا ہوں کہ امر بالمعروف اور نہی از منکر کروں اور اپنے جد اور باپ کی سیرت پر چلوں' پس جس نے بھی اس کو قبول کیا حق کے قبول کرنے کے ساتھ تو اللہ حق کیلئے زیادہ سزاوار ہے اور بہترین حاکم ہے اور یہ میری وصیت ہے تم سے اے بھائی! اور اللہ ہی سے توفیق چاہتا ہوں' اسی پر بھروسہ کرتا ہوں اور اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں"۔

یہ لکھ کر آپؑ نے وہ نوشتہ لپیٹا اور اس پر اپنی مہر لگادی اور اپنے بھائی محمد کو دیدیا اور پھر ان سے رخصت ہو کر آدھی رات کو روانہ ہو گئے۔

نیز یہی الفاظ "انی لم اخرج اشراً ولابطراً۔وانما خرجت لطلب الاصلاح فی امت جدی محمدؐ" حضرت نے ابن عباس کے جواب میں بھی فرمائے تھے۔ (مناقب' ابن شہر آشوب (چھٹی صدی) ۳/ ۲۴۱)

امام علیہ السلام کے مذکورہ الفاظ سے دو باتیں واضح ہوئیں :

۱۔ "اشر و بطر" کے معنی ہیں زیادتی نعمت کی وجہ سے اپنے آپ سے باہر ہو جانا۔ مقصد یہ ہے کہ میں رسولؐ اللہ کا نواسہ یا علیؑ و فاطمہؑ کا فرزند ہونے کی وجہ سے کسی غرور و تمکنت میں مبتلا نہیں ہوں کہ اپنی خاندانی وجاہت جتانے کیلئے بغیر سوچے سمجھے اتنا بڑا اقدام کر بیٹھوں۔ نہیں، میرا قیام عاقلانہ و حکیمانہ ہے۔

۲۔ حکومت اسلامی وہ حکومت ہے جس میں حق کا بول بالا ہو، سنت محمدی اور سیرت حیدری پر موبہ مو عمل کیا جائے۔

اہل کوفہ کے خطوط کا جواب

اہل کوفہ کے ہزاروں خطوط کے جواب میں آپ نے اپنا آخری خط ہانی بن ہانی اور سعید بن عبداللہ کے ہاتھ جو بھیجا تو اس کے الفاظ یہ تھے :

"......امابعد فان هانیا و سعیداً قد ماعلی بکتبکم

......فلعمری ماالامام الا الحاکم بالکتاب القائم بالقسط الذین بدین الحق الحابس نفسه علیٰ ذات الله والسلام"۔

"ہانی اور سعید کے ذریعہ جو خط (اہل کوفہ) نے مجھ کو بھیجے ہیں انکے مضمون سے آگاہ ہوا۔ اپنی جان کی قسم امام نہیں ہو سکتا مگر وہ شخص جو کتاب خدا کے مطابق حکم کرے، انصاف پر قائم رہے، دین حق کا پابند ہو اپنے نفس کو ذات خداوندی کا اسیر کر دے، والسلام"۔

(نفس المہموم ص ۵۰ روایت از شیخ مفیدؒ)

لشکر حُر کے سامنے حضرتؑ کا پہلا خطبہ

امام حسینؑ نے حُر بن یزید ریاحی کے لشکر کے سامنے تین خطبے دیئے جن سے

پتہ چلتا ہے کہ ''حکومت اسلامی'' کا خاکہ کیا ہے اور اس سلسلہ میں امام کیا چاہتے تھے' پہلا خطبہ نماز ظہر سے پہلے ارشاد کیا' اس میں آپ نے فرمایا :

"ایھا الناس! انھا معذرة الی اللہ عزوجل والیکم ' انی لم آتکم حتی اتتنی کتبکم وقدمت بھا الی رسلکم ان اقدم علینا فانه لیس لنا امام ولعل اللہ ان یجمعنا بك علی الھدیٰ ۔فان کنتم علی ذلك فقد جئتکم فاعطونی مااطمئن به من عھود کم ومواثیقکم ۔وان کنتم لمقدمی کارھین' انصرفت عنکم الی المکان الذی جئت منه الیکم"۔

''اے لوگو! یہ میرا عذر ہے اللہ کے سامنے اور تمہارے سامنے' میں تمہارے پاس اس وقت تک نہیں آیا جب تک کہ تمہارے خطوط نہ آئے اور تمہارے فرستادہ نمایندہ نہ آئے' انہوں نے کہا کہ آپ ہماری طرف آجایئے' ہمارا کوئی امام نہیں ہے۔ شاید اللہ آپ کی وجہ سے ہم کو ہدایت پر اکٹھا کر دے' پس اگر تم اپنے اس قول پر باقی ہو تو لو میں تمھارے پاس آگیا ہوں۔ اپنے عہدوں کو پورا کرو' اور اگر تم کو میرا آنا ناگوار ہے تو میں وہیں پلٹا جاتا ہوں جدھر سے آیا ہوں''۔ (تاریخ ابن اثیر ۳ / ۳۸۰ بحوالہ حیات امام حسینؑ تالیف باقر شریف ۳ / ۷۸)

حضرت کے اس کلام سے دو چیزیں معلوم ہوئیں :

۱۔ حضرت خود نہیں آئے بلکہ لوگوں کے اصرار پر آئے' انہوں نے کہا کہ ہم بغیر امام کے ہیں کوئی ہماری ہدایت کرنے والا نہیں' ظاہر ہے اس صورت میں رہبر کا فریضہ ہے کہ اپنی امت کی رہبری کرے ورنہ بروز قیامت خدا کو کیا جواب دے گا۔ امام حسینؑ اسلامی سیاست اور قانونی حیثیت کے روبرو تھے۔ سیاسی نقطۂ نظر سے عوام کا واقعی ایک بڑا گروہ یزید سے بیزار تھا اور وہ

احتجاج کیلئے باہر نکلنے کو تیار تھا۔ اسے ایک رہنما چاہئے تھا۔ مذہبی لحاظ سے امام حسینؑ سلسلہ وار ایک بہت بڑی سیاسی تاریخ اور دینی پس منظر کی روایت رکھتے تھے اور اب وقت آچکا تھا کہ انحراف و منحرفین پر سخت چوٹ لگائیں۔ یہ کہنا چونکہ اہل کوفہ نے ان کے بابا اور بھائی کے ساتھ بے وفائی کی تھی لہٰذا امام حسینؑ کو ان کی بات نہ ماننا چاہئے تھی' عوام الناس کیلئے شاید درست ہو' مگر امام حسینؑ جیسا عظیم رہنما اس بات کو قاعدۂ کلیہ کیسے سمجھ سکتا تھا جبکہ اہل کوفہ میں میثم تمار' رشید حجری' مسلم بن عوسجہ' حبیب بن مظاہر جیسے عاشقانِ خدا و فدائیان حسینؑ موجود تھے۔

۲۔ آپؑ کی قانونی اور سیاسی ذمہ داری و منصب امامت کا تقاضا تھا کہ حالات کے بارے میں موثر کردار ادا کریں اور اندھیروں میں روشنی کی ایک ایسی لکیر ڈال دیں جو آہستہ آہستہ شعلہ اور مینارِ نور بن جائے۔ امام حسینؑ نے قدم بڑھایا اور کربلا کا رخ کیا۔ وقت اتنا نازک اور اقدام اتنا اہم تھا کہ سب ہکّا بکّا رہ گئے۔ یزید کی شہنشاہی کا طنطنہ' عوام کی دعوت' امام حسینؑ کی للکار نے' حکومت دوستوں کو لرزا دیا۔ ان کی منطق لاجواب تھی۔

لشکرِ حُر کے سامنے امام حسینؑ کا دوسرا خطبہ

امام حسین علیہ السلام نے پہلا خطبہ دے کر نماز ظہر ادا کی۔ آپ کے اصحاب اور لشکر حر دونوں نے آپ کی اقتدا میں نماز پڑھی' نماز کے بعد کھانا کھایا گیا تھوڑی دیر کے بعد نماز عصر کا وقت آگیا' نماز عصر بھی دونوں لشکروں نے آپ کے پیچھے پڑھی جب پورا مجمع نماز و تعقیبات سے فارغ ہو گیا تو حضرت دوبارہ کھڑے ہوئے اور خدا کی حمد و ثنا و نعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد یہ تقریر کی:

"ایھاالناس! ان تتقواللہ وتعرفوا الحق لا ھلہ یکن ارضیٰ للہ"

ونحن اهل البیت اولی بولایة هذا الامر من هؤلاء المدعین مالیس هم؛ والسّائرین فیکم بالجور والعدوان؛ فان انتم کرهتمونا وجهلتم حقنا وکان رأیکم الآن علی غیرمااتتنی به کتبکم انصرفت عنکم"۔

"اے لوگو! اگر تم اللہ سے ڈرو اور اہل حق کے حق کو پہچانو تو یہ اللہ کی رضامندی کا زیادہ باعث ہوگا اور ہم ہیں اہل بیت رسول اللہ جو اس امر (حکومت اسلامی) کیلئے اولیٰ ہیں ان سے جو اس کے جھوٹے دعویدار ہیں اور تم پر ہر طرح کا ظلم وجور کررہے ہیں، پس اگر تم ہم کو ناپسند کرتے ہو اور ہمارے حق کے منکر ہوگئے ہو اور اب تمہاری رائے تمہارے خطوط کے مضمون سے مختلف ہوگئی ہے تو میں تم سے قطع نظر کرتا ہوں"۔

(تاریخ ابن اثیر ۳ / ۲۸۰ بحوالہ حیات امام حسین ۳ / ۸۷، ارشاد مفید بحوالہ مقتل سید مقرم ص ۲۱۷)

اس خطبہ میں بھی حضرت نے اس بدقسمت قوم کو جن امور کی طرف توجہ دلائی وہ حسب ذیل ہیں:

۱۔ حکومت اسلامی کے جائز حقدار اہل بیت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔

۲۔ یزید اور اس جیسے افراد جھوٹے دعویدار ہیں۔

۳۔ ان کے اس دعوے کے بطلان کی دلیل ان کا ظلم وعدوان ہے کیونکہ حاکم عادل حکومت اسلامی کبھی رعایا پر ظلم نہیں کرتا۔

۴۔ اگر تم اپنے خطوط میں لکھے ہوئے مطالبے سے منحرف ہوگئے ہو ہمارے حق کو فراموش کر رہے ہو، اور ہمارا آنا پسند نہیں کرتے۔ تم ہم بھی تم سے کوئی مطلب نہیں رکھتے ہم جو راستہ اپنے لئے طے کرچکے ہیں، اس پر آگے بڑھتے رہیں گے۔

تم سے ہمیں نہ پہلے امید تھی نہ اب ہے۔ ہم تو اللہ پر بھروسہ رکھتے ہیں۔

لشکر حر کے سامنے حضرت کا تیسرا خطبہ

جب امام حسین علیہ السلام مقام "بیضہ" میں پہنچے لشکر حر بھی آپ کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ اس مقام پر حضرت نے منزل کی اور ایک ایسا خطبہ ارشاد کیا جس میں "حکومت اسلامی" اور "حکومت باطل" کے نقوش وحدود اچھی طرح واضح کر دیئے۔ حضرت اپنی شمشیر پر سہارا دے کے کھڑے ہوئے اور خدائے متعال کی حمد و ثنا اور صلوات بر رسولؐ خدا کے بعد یوں ارشاد فرمایا:

"ایها الناس ان رسول الله (ص) قال :"من رأى سلطانا جائرا مستحلاً لحرم الله' ناكثاً لعهدالله ' مخالفاً لسنة رسول الله (ص) يعمل في عبادلله بالاثم والعدوان؛ فلم يغير ما عليه بفعل ولاقول كان حقاً على الله ان يدخله مدخله الخ"۔

"لوگو! حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جو شخص کسی ظالم بادشاہ کو دیکھے کہ وہ محرمات الٰہی کو حلال کرنے والا ہو اور اللہ کے عہد کو توڑنے والا ہو، رسول اللہؐ کی سنت کا مخالف ہو، اللہ کے بندوں میں گناہ اور سرکشی کا برتاؤ کرے اور اس کو اپنے فعل سے بدلنے کی کوشش نہ کرے اور نہ اس پر اپنے قول سے اعتراض کرے تو اللہ کو اس کا حق ہے کہ وہ اس شخص کو جہنم میں داخل کرے جس جگہ ظالم بادشاہ کو داخل کرے گا۔

اس کے بعد آپؑ نے فرمایا:

آگاہ ہو جاؤ! کہ ان لوگوں نے شیطان کی اطاعت کو اختیار کیا ہے اور رحمان کی اطاعت کو ترک کر دیا ہے۔ فتنہ وفساد کو آشکار کیا ہے اور حدود الٰہی کو معطل کر دیا ہے اور مالِ خدا پر قبضہ کر لیا ہے اور میں اپنے غیر سے

اس حکومت الٰہی کے لئے اولیٰ ہوں۔ میرے پاس تمہارے خطوط آئے اور نمایندے بھی آئے اور انہوں نے کہا کہ تم نے میری بیعت کی ہے اور اس بات کا وعدہ کیا ہے کہ آخر وقت تک اس بیعت پر باقی رہو گے اور مجھ کو تنہا نہ چھوڑو گے۔ پس اگر تم اپنی بیعت پر باقی ہو تو راہ ہدایت پاؤ گے کیونکہ میں حسینؑ بن علیؑ اور پسر فاطمہ زہراؑ بنت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہوں۔ میری جان تمھاری جان کے ساتھ ہے اور میرے متعلقین تمہارے متعلقین کے ساتھ ہیں (یعنی جو تم پر گزرے گی وہ مجھ پر بھی گزرے گی اور دونوں کا ایک انجام ہو گا)۔

اور اگر تم نے ایسا نہ کیا اور میری بیعت کو توڑ دیا اور اپنے وعدے سے پھر گئے تو اپنی جان کی قسم یہ تم سے کوئی بعید نہیں ہے کیونکہ تم نے یہی سلوک میرے باپ' بھائی اور ابن عم مسلم کے ساتھ بھی کیا تھا اب اگر کوئی تم سے دھوکا کھائے گا تو وہ بڑا دھوکا اٹھانے والا ہو گا تم نے (میرا کچھ نہیں بگاڑا بلکہ) اپنا ہی نقصان کیا ہے' کیونکہ جو بیعت توڑتا ہے وہ اپنے کو نقصان پہنچاتا ہے اور مجھ کو عنقریب تم لوگوں سے اللہ بے نیاز کر دے گا۔ والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ"۔ (طبری ۶ / ۲۲۹)

ہمارے موضوع "خطبات امام حسینؑ میں حکومت اسلامی کے نقوش" سے مربوط یہ آخری خطبہ ہے کیونکہ اس کے بعد کے خطبات وارشادات میں زیادہ تر موعظہ وارشاد کا پہلو ملحوظ رکھا گیا ہے۔

بہر حال مذکورہ بالا خطبہ سے حسب ذیل امور پر روشنی پڑتی ہے :

۱۔ "سلطاناً جائر" چاہے بادشاہ کے لباس میں ہو یا خلافت کا روحانی لبادہ اوڑھ لے اس کے مظالم کے سامنے سکوت حرام ہے' اگر شرایط "اقدام" موجود ہوں تو

اس کے خلاف اقدام کرنا چاہئے ورنہ اپنے قول سے اس کے اعمال بد سے بیزاری کا اظہار کرنا چاہئے۔ یہ بھی اس وقت ہے جبکہ منافی حکم تقیہ نہ ہو' ورنہ بعض اوقات ایسا ہو سکتا ہے کہ ایک حرف حق کہنے کی وجہ سے اپنی یا کسی دوسرے مومن کی جان بھی چلی جاتی ہے اور دین کیلئے کوئی نتیجہ بھی بر آمد نہیں ہوتا۔

کہاں اقدام و قیام کرنا چاہئے اور کہاں خاموشی اختیار کرنا چاہئے؟ یہ سمجھنا عام اشخاص کا کام نہیں ہے' اس کو تو صرف "فقیہ جامع الشرایط" ہی سمجھ سکتا ہے کیونکہ ہمارے سامنے امام حسین علیہ السلام اور امام حسن علیہ السلام دونوں اماموں کی سیرتیں موجود ہیں' تشخیصِ فعلِ امام' نائب امامِ برحق کا کام ہے۔

۲۔ اس خطبہ میں امام عالی مقامؑ نے یہ بتلا دیا کہ جس حکومت کی بنیاد شیطان کی پیروی پر ہو' اور اس میں خدائی فرامین کی مخالفت کی جائے' ظلم و فساد کا رواج ہو' حدود الٰہی میں تحریف کی جائے' حلال کو حرام' حرام کو حلال کر دیا جائے وہ باطل حکومت ہے' خلافت الٰہیہ اور "حکومت اسلامی" سے اس کو دور کا لگاؤ نہیں اور یزیدی حکومت اس کا بہت واضح نمونہ ہے۔

۳۔ "حکومت الٰہی" کی زمامداری کا جائز وارث امام وقت ہے' اس کی موجودگی میں یزید جیسوں کو کسی قسم کا کوئی حق نہیں۔

۴۔ ناواقفِ حقائق عوام کی مخالفت سے امام وقت کے فیصلے اور اقدام کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ امام براہ راست فیصلہ کرتا ہے۔ امام ان لوگوں کا ہرگز پابند نہیں جو آئے دن رائے بدلتے اور ہر ہوا کے ساتھ جگہ بدلتے ہوں۔ تم یہ نہ سمجھنا کہ ہم تمہارے پابند ہیں۔ اگر تم کہو تو میں یہاں سے چلا جاؤں' کوفہ نہ سہی کربلا' کربلا نہ سہی نجف و بغداد۔ مجھے کرنا تو وہی ہے جو میری ذمہ داری ہے۔ تم کو تکلیف دینا ہمارا مقصد نہیں ہے۔

لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ حضرت نے کسی قسم کی کمزوری یا خوف کا اظہار فرمایا تھا۔ اس وہم کو آپ نے اس وقت دور کر دیا جب اس خطبہ کے بعد حر نے کہا :

"انی اذکرك الله فی نفسك فانی اشهد لئن قاتلت لتقتلن "۔

"میں آپ کی جان کے بارے میں آپ کو خدا یاد دلاتا ہوں ' کیونکہ مجھ کو یقین ہے کہ اگر آپ نے جنگ کی تو آپ ضرور قتل کیے جائیں گے "۔

آپؑ نے فرمایا : "أبالموت تخوفنی " کیا تو مجھ کو موت سے ڈراتا ہے ؟ اس کے جواب میں میں تجھ سے کیا کہوں سوائے اس کے کہ میں وہی اشعار پڑھے دیتا ہوں جو مرد "اوسی" نے اپنے چچازاد بھائی کے سامنے اس وقت پڑھے تھے جب اس نے اس کو رسول اللہ کی مدد کرنے سے روکا تھا اور یہ کہا تھا کہ : "این تذہب فانک مقتول " تو کہاں جاتا ہے ؟ تو مار دیا جائے گا۔ اس کے بعد آپ نے یہ اشعار پڑھے :

سأمضی وما بالموت عار علی الفتی　　اذا ما نویٰ خیرا وجاهد مسلما

وآسی الرجال الصالحین بنفسه　　وخالف مثبورا وفارق مجرما

فان عشت لم اندم وان مت لم ألم　　کفی بك ذلاً أن تعیش وترغما

میں اپنے اسی راستہ پر چلوں گا اور مرد آزاد کے لئے مرنے میں کوئی ذلت نہیں ہے جبکہ اس کی نیت خیر ہو اور مسلمان ہونے کی حالت میں جہاد کرے۔ اور اپنی جان کو نیکوکار لوگوں پر فدا کر دے اور ملعون و مجرم لوگوں سے مخالفت کرے۔

پس اگر میں زندہ رہا تو مجھ کو ندامت نہ ہوگی اور اگر مارا گیا تو ملامت نہ ہوگی۔ بہر حال تیرے لئے یہ ذلت بہت بڑی ہے کہ ذرا سی زندگی

حاصل کرنے کیلئے تیری ناک رگڑ دی جائے۔

(مجلّہ توحید شمارہ ۳ ص ۱۲۷)

مصادر

☆۔ قرآن مجید

☆۔ تاریخ :اعثم کوفی

☆۔المقتل : خوارزمی

☆۔ نفس المہموم : شیخ عباس قمی

☆۔الامام الحسین :باقر شریف

☆۔ مثیر الاحزان :ابن نما حلی

☆۔ مقتل عوالم

☆۔المناقب :ابن شہر آشوب

☆۔التاریخ :ابن اثیر

☆۔المقتل : عبد الرزاق مقرم

شہادتِ حسینؑ

ایک آگاہانہ اقدام

مقالہ نگار : سید حسنین رضوی کراروی

۱۱ھ مسلمانوں کیلئے بڑا ہی صبر آزما سال ثابت ہوا۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسلم معاشرہ کو اتحاد و ہم آہنگی اور شعائر اسلام کے تحفظ کی وصیت و نصیحت کرتے ہوئے ہمیشہ کیلئے اس فانی کائنات سے آنکھیں بند کر لیں۔ مدینہ کی فضاء' جانِ مدینہ کے اٹھ جانے سے ادس ہو گئی۔ اسلامی معاشرہ کو گویا غم کا پہلا شدید جھٹکا لگا۔ امت کے مخلصین کفن دفن کے انتظام میں مشغول تھے لیکن ایک طبقہ ایک مشہور و معروف جگہ پر مسلمانوں کی قسمت کا فیصلہ کر رہا تھا۔ فیصلہ ہو گیا اور اتحاد کی وصیت' پیغمبرؐ کے ساتھ ہی دفن ہو گئی۔ اب دو طبقوں میں سے ایک طبقہ وہ ہے جسے پیغمبر اسلامؐ کی وصیت کا پاس و لحاظ ہے وہ اگرچہ احقاق حق کیلئے زبان و کردار سے کام لے رہا ہے لیکن دفاع اسلام میں ہمیشہ مصروف رہنے والی تلوار نیام کی زینت بنی ہوئی ہے۔

وصیتِ پیغمبرؐ کو نظر انداز کرنے والے طبقہ نے الٰہی عہدہ و منصب کو امت کا حق سمجھا اور اسے مسلم معاشرہ کی جاگیر جانتے ہوئے اموی خاندان کو بھی اپنا شریک کار بنالیا۔ جن کیلئے پیغمبر اکرمؐ کی صریح روایت امام حسین علیہ السلام کی

زبان نقل ہوئی ہے:

"ان الخلافة محرمة علی آل ابی سفیان فاذارایتم معاویة علیٰ منبری فابقرا وبطنه"۔ (لہوف ص ۲۰، مثیر الاحزان ص ۱۰، مقتل عوالم، ص ۵۳، مقتل خوارزمی جلد ۱، ص ۱۸۵)

"آل ابوسفیان پر خلافت حرام ہے اور جب تم لوگ معاویہ کو میرے منبر پر دیکھنا تو اس کا پیٹ پھاڑ دینا"۔

معاویہ کو خود اپنے بھائی یزید بن ابی سفیان کے مرنے کے بعد شام کی گورنری ملی تھی پھر قتل عثمانؓ کے بعد مسلمانوں نے خلافتِ علی علیہ السلام پر اتفاق کر لیا۔ لیکن معاویہ نے موقع پاتے ہی عَلَم بغاوت بلند کر دیا اور شام میں اپنے استقلال کا اعلان کر دیا۔ نتیجتاً علیؑ سے نبرد آزمائی اور ناکامی کے بعد حکمیّت کی چال چل کر مسلمانوں میں افتراق کی آگ کو اور ہوا دی۔ ماہِ مبارک رمضان میں ابن ملجم نے زہر آلود تلوار سے مسجد کوفہ میں مسلمانوں کے خلیفہ حضرت علی علیہ السلام کو زخمی کر دیا۔ ۲۱ / رمضان المبارک کو آپؑ کی شہادت واقع ہو گئی۔ گویا معاویہ کی مانگی مراد پوری ہوئی۔ شام میں جشن کا اہتمام ہوا۔ لیکن حسن علیہ السلام کا وجود معاویہ کیلئے علی علیہ السلام کے وجود سے کم بے چینی کا باعث نہیں تھا۔ معاویہ نے پوری قوت صرف کر کے خاندانِ پیغمبرؐ سے انتقام جوئی اور کینہ توزی کے حوصلے پورے کئے۔ انہوں نے امام حسنؑ کے فوجی افسروں کو خرید کر مسلمانوں میں مزید انتشار کی فضا قائم کر دی اور انہیں رہبریت کے سلسلہ میں شک وشبہ میں مبتلا کر دیا۔ اس دوران معاویہ نے اپنے اقتدار کے ناجائز استعمال اور بنو ہاشم کے تقوائے سیاسی کے پیش نظر انہیں ہر طرح کے الزام سے متہم کر کے خود کو قرابتدار رسول کی حیثیت سے لوگوں کے سامنے پیش کیا۔

۵۰ھ میں حکومت شام نے امام حسن علیہ السلام سے کی ہوئی صلح کی تمام شرائط پائمال کرتے ہوئے خود انکی زوجہ کو لالچ دیکر زہر دینے پر آمادہ کر لیا اور ۲۸ صفر کو آپؑ کی شہادت نے معاویہ کو قلبی سکون فراہم کر دیا۔

حیات امیر شام کے مطالعہ سے تاریخ کا ایک طالب علم یہ اندازہ لگانے پر مجبور ہے کہ وہ اپنے مقصد (حکومت) کے حصول کیلئے کسی بھی زشت مرحلے سے گزرنے کیلئے بڑے ہی وسیع القلب کام لیا تھا۔ انہوں نے مسلمانوں پر فقط یزید کی رہبریت مسلط کرنے کیلئے آخری سانس تک اس مہم میں صرف کر دی۔ صلحنامہ کی شرائط میں سے ایک اہم شرط یہ بھی تھی کہ موصوف کے بعد خلافت امام حسنؑ اور ان کے نہ ہونے کی صورت میں امام حسین علیہ السلام کی طرف منتقل ہو گی۔ لیکن معاویہ نے اس شرط سے فرار کیلئے اپنی زندگی ہی میں یزید کیلئے بیعت لینا شروع کر دی۔ مدینہ آکر اشرافِ امت کو بڑے بڑے انعام سے نوازا' انھیں اپنا ہم خیال بنانے کیلئے خزانوں کے منہ کھول دیئے اور عہدوں کے سبز باغ دکھا کر ان کے ضمیروں کو خرید لیا۔ امت کا متوسط اور پائین طبقہ بے ارادگی کی مصیبت کا شکار ہو گیا۔ اسکے ارادے کمزور' روح خوار اور ہمتیں پست ہو گئیں۔

ان تمام باتوں کے ساتھ ساتھ لوگ اموی خلفاء کی بے دینی سے بھی بخوبی واقف تھے اور انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ حسین علیہ السلام' اسلام کے حقیقی رہبر ہیں' لیکن امت میں نہ تو اس حقیقت کے اظہار کی ہمت تھی اور نہ ہی رہبر اسلام کی نصرت کا حوصلہ۔

ان کے دل حسینؑ کے ساتھ تھے لیکن تلوار بنو امیہ کی حمایت میں بلند تھیں۔ (قول فرزدق۔ طبری جلد ۴ ص ۲۹۰ کامل ابن اثیر جلد ۳ ص ۳۸۶)

معاشرہ کے سرد و گرم کا بخوبی احساس کرنے والے طلیق اللسان اور حق گو

شاعر کا یہ جملہ حالاتِ زمانہ کا بہترین عکاس ہے۔ بنو امیہ نے اپنے ناجائز اقتدار کا غلط استعمال کر کے پورے سماج کو اپنے ظلم و ستم اور سیاسی جوڑ توڑ سے ایسا ششدر کیا ہے گویا وہ اپنے سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت کھو بیٹھا۔ ایسی صورت حال میں امامؑ نے ستّر (۷۰) بہتّر (۷۲) مردوں، خواتین اور بچوں کے ساتھ قیام کیا۔ آپ کو معلوم تھا کہ یزید آپؑ کی راہ میں رکاوٹ کھڑی کرنے کیلئے ایڑی چوٹی کا زور صرف کردے گا۔ (چپ وراست در اسلام، ص ۱۶۲)

آپؑ کو اس اقدام کے نتائج کی بھی اطلاع تھی۔ اس لئے کہ یزید اپنی حکومت کو قانونی ثابت کرنے کیلئے دیوانگی کی حد تک پریشان تھا۔ اس سلسلے میں اس نے اپنے سیاست مدار باپ کی نصیحتوں کو بھی پس پشت ڈال دیا۔ اور اپنی انا کی تسکین کیلئے نتائج سے بے پروا ہو کر احکامات صادر کر دیئے۔ اور بزعم خود حق کو نیست و نابود کرنے کی تیاریاں مکمل کرلیں۔ ان طاغوتی سازشوں کے مقابل فقط حسینؑ کی ذات گرامی تھی جو اپنی فداکاری اور ایثار سے امت میں ایک نئی تحریک کی روح پھونک سکتی تھی اور امت کے بے حس ضمیر اور مردہ وجدان کو مہمیز کرنے کیلئے آپ کا اقدام ہی مناسب روش تھا۔ آپ جانتے تھے کہ آپکی عادلانہ پکار اور المناک شہادت ہی ہر مسلمان کو خواب غفلت سے بیدار کر کے خود اپنے بارے میں اور اسلام کے حال و مستقبل کے سلسلے میں لحۂ فکریہ فراہم کر سکتی ہے۔

امام مظلومؑ نے معاشرہ کے خواب آلود چہرہ پر اپنے مقدس خون کے چھینٹے دیکر اسے بیدار کر دیا۔ مسلمانوں کو رہبریت کے سلسلے میں شک و تردید کے مہلک مرض سے نجات دلائی اور شریعت کی حمایت کیلئے ایک استوار موقف فراہم کیا تاکہ انحراف و کجروی کے مقابل انہیں استقلال نصیب ہو۔

اگرچہ انقلاب حسینیؑ کو غیر مؤثر بنانے اور آپؑ کو اس تعمیری قیام سے باز رکھنے

کیلئے اپنوں اور غیروں نے ہر ممکن کوشش کی اور بزعم خود انہیں اپنے مفید مشوروں سے بھی نوازا۔ اس سلسلے میں انکی دلیل یہ تھی کہ اس احتمالی مقابلہ میں آپ کی فوجی شکست یقینی ہے۔ لیکن امام حسینؑ جو اپنی الٰہی بصیرت کی بناء پر جانتے تھے کہ حقیقتاً ان کی شہادت میں ہی ان کی کامیابی کا راز مضمر ہے۔ لہٰذا قطعاً اس بات کی پروا نہیں تھی کہ فوری طور پر انہیں فوجی کامیابی نصیب ہو گی یا ظاہراً ناکامی ہو گی۔ ایسا نہیں ہے کہ وہ اس انقلاب میں اپنے انصار و اعوان کی قلت کی طرف متوجہ نہ رہے ہوں یا واقف نہ رہے ہوں کہ اس تحریک میں آپ کو ان سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔

اگر کوئی شخص امامؑ کو ان کے برپا کردہ انقلاب کے آئینہ میں پہچاننا چاہتا ہے تو اسے قیام کے مقاصد اور ظاہراً نا مطلوب نتائج کو مورد بحث قرار دینا پڑے گا۔

امام علیہ السلام کا مقصد مادّی حکومت و قدرت کا حصول نہیں تھا اور آپؑ نہضت کربلا کے ظاہری انجام اور فکری نتیجہ سے بخوبی آگاہ تھے۔ نصیحت کرنے والوں اور موت سے ڈرانے والوں کے جواب میں فرماتے تھے کہ بیشک ہم نے اپنی زندگی سے ہاتھ دھو لیا ہے اور الٰہی قوانین کو معاشرہ میں نافذ کرنے کا عزم بالجزم کر لیا ہے۔ جب آپؑ کے بھائی محمد بن حنفیہ نے نصیحت کے طور پر کہا کہ آپ سے زیادہ مجھے کوئی پیارا نہیں ہے اور میری نصیحت و غم خواری کے زیادہ آپ ہی حقدار بھی ہیں اور میں نے آج تک ایسی نصیحت کسی کو کی بھی نہیں ہے کہ اگر آپ یزید کی بیعت نہیں کرنا چاہتے تو یمن وغیرہ کا رخ کیجئے۔ تو آپؑ نے اپنے بھائی کے جواب میں فرمایا خداوند عالم مجھے اپنی راہ میں شہید اور میری ناموس کو اسیر دیکھنا چاہتا ہے۔ (مقتل الحسینؑ۔ عبدالرزاق مقرم ص ۱۴۹۔ ۵۵' لہوف۔ ص ۶۵)

اسی طرح ہمدردی کے طور پر عبداللہ بن عمر بن خطاب نے آپؑ کو مدینہ میں روکنا چاہا اور آپؑ نے انکی اس خواہش کو قبول نہ فرمایا۔ عبداللہ بن زبیر نے آپؑ سے

کہا کہ اگر آپ حجاز ہی میں قیام فرمائیں تو ہم آپؑ کی حمایت اور غمخواری میں کمی نہ کریں گے اور آپؑ کی بیعت کر لیں گے اور اگر آپؑ خود سے بیعت لینا نہیں چاہتے تو ہمیں اجازت دیجئے کہ ہم آپؑ کی طرف سے بیعت لے لیں، لوگ آپؑ کی فرمانبرداری کریں گے اور سر مو ل مخالفت نہ کریں گے۔

(ابو الشہداء، عقاد ص ۶۳)

یا پھر عبداللہ بن جعفر طیار اور ان کے دو بیٹوں عون و محمد نے آپؑ کو لکھا......امابعد! میری خدا سے دعا ہے کہ اس خط کو پڑھتے ہی اس کام سے جس میں آپؑ کی شہادت اور خاندان کی دربدری ہے دستبردار ہو جائیں گے۔ ہم لوگ آپؑ کے غمخوار اور بہی خواہ ہیں۔ اگر آپؑ نہ رہیں گے تو زمین تاریک ہو جائیگی کیونکہ آپؑ ہی ہدایت پانے والوں کیلئے پرچم اور اہلِ ایمان کی امید ہیں۔ آپؑ جلدبازی سے کام نہ لیں۔

(مقتل الحسینؑ ص ۱۹۶۔ طبری ج ۴ ص ۲۸۷ کامل ابن اثیر ج ۳، ص ۲۷۵)

امام حسینؑ علیہ السلام اپنی باخبری کا اعلان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اگر میں حشرات کے سوراخ میں پناہ گزین ہو جاؤں تو یہ مجھے وہاں سے بھی نکال کر اپنا مقصد پورا کریں گے۔ (مقتل الحسینؑ ص ۱۹۶۔ طبری ج ۴ ص ۲۸۹ کامل ابن اثیر ج ۳، ص ۲۷۵، ۲۷۶)

عمر ابن لوذان نے آپؑ کو نصیحت کرنے اور برے نتائج سے ڈرانے کیلئے کہا:

اے فرزند رسولؐ! خدا کیلئے اپنے ارادے کو بدلئے، خدا کی قسم آپ آگے نہیں بڑھ رہے ہیں مگر نیزوں کی انیوں اور تلواروں کی دھار پر۔ اگر آپؑ کو خط لکھنے والے، آپؑ کی ہمراہی میں جنگ کیلئے آمادہ ہوں اور اپنی شمشیر سے آپؑ کی حمایت کریں تو اس وقت آپ کا انکے پاس جانا غلط نہ ہوگا۔

(اعلام الوریٰ باعلام الہدیٰ از طبرسی، ص ۲۳۲)

امام حسینؑ نے فرمایا: خدا کی قسم یہ بات مجھ پر پوشیدہ نہیں ہے لیکن فرمانِ خدا پر کسی کا بس نہیں ہے اور یہ لوگ جب تک میرا ان خون نہ بہالیں گے مجھ سے دستبردار نہ ہوں گے۔

آپؑ نے بڑے صبر و حوصلہ کے ساتھ ایک عظیم مقصد کی خاطر پورے خاندان کے ساتھ مدینہ کو الوداع کہا اور مکہ تشریف لائے۔ جب کوفہ والوں کو آپؑ کی مدینہ سے مکہ روانگی کی اطلاع ملی تو خطوط اور نامہ بروں کا ایک تانتا بندھ گیا ۔ موصول ہونے والے مکتوبات کا مضمون تقریباً ایک ہی تھا۔ کہ ہم رہبر کے بغیر کیونکر زندگی گزار سکتے ہیں، آپ جلدی تشریف لائیے تاکہ ہمیں آپ کی رہنمائی میں دنیا و آخرت کی سعادت نصیب ہو۔ اگر آپ نے ہماری فریاد پر توجہ نہ فرمائی تو کل روز قیامت آپؑ کا دامن پکڑیں گے۔

۱۰/ محرم ۶۱ھ خاندان فاطمہ و علیؑ کیلئے نہایت المناک تاریخ ہے کیونکہ اسی دن حسینؑ نے رسول سے کئے ہوئے عہد و پیمان کی ادائیگی کیلئے تمام قربانیان پیش کرنے کے بعد سجدۂ خالق میں سر رکھ دیا اور سر و تن میں جدائی کے بعد ہمیشہ کیلئے زندہ ہوگئے۔ یزید اپنی فتح کے جوش میں ہوش و حواس کھو بیٹھا اور اپنی کامیابی کے سرور کو دو آتشہ کرنے کیلئے خاندانِ عصمت و طہارت کے بچے کچھے افراد کو گرفتار کرالیا اور ان میں کچھ بی بیاں تھیں اور مظالم کا نشانہ بنے ہوئے چند یتیم بچے۔

اہل بیتؑ کے اس لٹے ہوئے قافلہ نے کوفہ و شام کے بازاروں اور درباروں میں موقع کی مناسبتوں سے زبانیں کھولیں اور غمزدہ لہجہ میں اپنا تعارف کرایا۔ بیتے ہوئے مصیبت کے لمحات کی منظر کشی کی۔ جس کی وجہ سے ظالم کو اپنے ظلم سے ندامت اور قاتل کو اپنے کئے پر شرمندگی ہونے لگی۔ فقط یہی نہیں بلکہ انقلابات کربلا کی تبلیغات نے وہ اثر کیا کہ فتح و کامیابی کے نشے سے سرشار یزید بغلیں

جھانکنے پر مجبور ہو گیا اور فتح و ظفر کا سہرا اتار کر پسر مرجانہ کو اس المیہ کا ذمہ دار قرار دینے لگا۔ حالات نے کچھ اس طرح کروٹ لی کہ تمام عالم اسلام بشمولہ شام، عراق، حجاز، یمن اور دوسرے شہروں میں غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی۔ شہادت حسینؑ نے قاتل گھرانوں تک کو سوگوار بنا دیا اور تماشائیوں کے لباس فاخرہ، سیاہ ماتمی لباس میں تبدیل ہو گئے۔

خاندان حسینؑ کی تشہیر اور اسیری نے پوری بساط ہی الٹ دی۔ حجاز میں یزید کے خلاف محاذ قائم ہو گیا جسے ختم کرنے کیلئے یزید کو اپنی فوج کا سہارا لینا پڑا۔ اور واقعۂ کربلا کے بعد سب سے بڑا غمناک واقعہ پیش آیا جس میں تمام مسلمانوں کی جان و مال کو مباح کر دیا گیا۔

اگرچہ امام مظلوم کو مشورہ دینے اور نصیحت کرنے والوں نے اہل بیت اطہارؑ کی ہمراہی کی بھی پر جوش مخالفت کی تھی لیکن آپؑ نے واقعۂ کربلا کی تمام جزئیات بیان کرتے ہوئے مخدرات عصمت و طہارت کی ہمراہی پر زور دیا اور تاریخ نے یہ ثابت کر دیا کہ اگر حسینؑ نے اپنے ساتھ اپنے خاندان کو نہ لیا ہوتا تو آپؑ کی یہ عظیم قربانی صحرائے کربلا میں ہی دم توڑ چکی ہوتی۔

یہ ستم رسیدہ اور غمزدہ خواتین کا ہی کارنامہ تھا جنہوں نے جہاد کی ایک نادر اور عظیم مثال قائم کر دی۔ جہاں بڑے بڑے سورما، لبوں کو جنبش دیتے ہوئے کانپتے ہیں وہاں چند بیکس بیبیوں نے اپنی فصاحت و بلاغت اور طلاقت لسانی کا کلمہ پڑھوا لیا اور یہ واضح کر دیا کہ فرزند پیغمبرؐ انہیں کسی اور غرض سے نہیں لائے تھے بلکہ آپؑ کو انہی خواتین کے ذریعہ مقصد شہادت کو واضح کرنا تھا جہاں بہادر مردوں کی نہیں شیر دل خواتین کی ضرورت ہے۔ آپؑ نے اپنے اس عمل سے یہ بھی ثابت کر دیا کہ کربلا کا واقعہ حالات کے غیر اختیاری نتائج کا نام نہیں ہے بلکہ ارادہ و اختیار

کے سایہ میں پروان چڑھنے والے ایفائے عہدو پیمان کا نام ہے۔ جسے آپؑ نے حفاظت دین کی خاطر اپنے پروردگار اور اپنے جد پیغمبرؐ خدا سے کیا تھا۔

خداوند عالم آج کے صبر آزما ماحول میں تحفظ دین کیلئے ہم سب کو کربلا والوں کے نقشِ قدم پر چل کر خدا سے کئے ہوئے عہدو پیمان کو نبھانے کی توفیق عنایت فرمائے۔

سید الشہداؑ کا کامیاب جہاد

مقالہ نگار : شہید ڈاکٹر بہشتیؒ

جس دن سے انسان کی تخلیق ہوئی ہے' مالک تقدیر نے اس کی زندگی جہاد ومبارزہ کے ہمراہ کردی ہے۔ انسان کی فطرت میں متضاد عوامل ودیعت کیے گئے ہیں اور اسے مختلف میلانات عطا ہوئے ہیں۔ اس کی خواہش اور رجحانات میں تلون وتنوع پایا جاتا ہے' اس کی کچھ خواہشیں ہوئی وہوس پر مبنی ہیں جنھیں حیوانی خواہشات سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اور اس کا مقصد کھانے پینے اور دیکھنے والی چیزوں نیز حیوانی لذتوں سے لطف اندوز ہونا ہے۔ ان خواہشات ومیلانات کے مقابلہ میں کچھ دوسری طاقتوری خواہشیں اور میلانات بھی اسے ودیعت ہوئے ہیں جو اسے حیوانی میدان سے دور کر کے ایک اعلیٰ وبرتر علاقہ میں داخل کرتی ہیں اسے معنوی عقلانی' نورانی اور انسانی زندگی کی طرف دعوت دیتی ہیں۔

انسان کی توانائیاں' قوتیں اور ارادے ان دو متضاد خواہشات ومیلانات کے درمیان کشمکش کا شکار رہتے ہیں۔ ایک انسان کو نظر میں رکھئے وہ کوئی معمولی کام انجام دینا چاہتا ہے۔ کچھ کام ایسے ہوتے ہیں جنھیں بجالانے کا وہ عادی ہوتا ہے۔ چونکہ اس کام کو بجالانے کی اسے عادت ہوتی ہے لہٰذا وہ پس وپیش کے بغیر اپنی

عادت کے مطابق اسے انجام دیتا ہے لیکن اگر کوئی ایسا کام ہو جو اس کی عادت میں شامل نہ ہو کوئی نیا کام ہو تو کیا وہ کسی جھجک کے بغیر فوراً ہی اسے انجام دے سکتا ہے! ہرگز نہیں اس کے اندر مختلف قسم کے رجحانات سر اٹھاتے ہیں۔ یہ کام خواہشوں کے مطابق ہے اور بعض کے خلاف۔ وہ سوچ میں پڑ جاتا ہے کہ کیا کروں ؟ انجام دوں یا نہیں ؟ کام اچھا ہے 'برا؟ نفس کہتا ہے کر ڈالو' عقل کہتی ہے ہرگز نہیں' یا عقل کہتی ہے بجالاؤ لیکن نفس مانع ہوتا ہے۔ کچھ عرصہ تک اس کے باطن میں ان میلانات کے درمیان جنگ جاری رہتی ہے۔ یہاں تک کہ کوئی ایک دوسرے پر غالب ہو جائے۔ جو عامل کامیاب ہو گا ارادہ اسی کے ساتھ ہو جائے گا اور تمام طاقتیں اسی سمت میں صرف ہوں گی۔

انسان کے اندر ہوئی وہوس اور معنوی زندگی' مادہ پرستی اور روحانیت کے درمیان جنگ ابتدائے تخلیق ہی سے جاری ہے اور اس کی زندگی کی بنیاد جہاد ومبارزہ ہی پر رکھی گئی ہے۔ یہ اندرونی جنگ جس سے ہم ہمیشہ دوچار رہتے ہیں اسے ایک طرف رکھئے۔ آئیے اب باہر کے ماحول پر نظر ڈالیں۔ ایک انسان کے مقاصد اور خواہشات کی راہ میں بے شمار رکاوٹیں پائی جاتی ہیں' چونکہ ہم رکاوٹوں کے عادی ہو چکے ہیں لہٰذا عام طور سے ہمیں ان رکاوٹوں کا اچھی طرح احساس نہیں ہوتا ورنہ اگر ذرا غور سے دیکھیں تو ہماری روزمرہ کی زندگی میں روزانہ کئی بار یہ رکاوٹیں پیش آتی ہیں جن سے ہمیں جنگ کرنا پڑتی ہے۔ باہر کی دنیا میں انسان کی زندگی جنگ وجدال اور جہاد ومبارزہ سے لبریز ہے۔ یہ تو ایک فرد کی بات تھی۔ آئیے قوموں' ملتوں اور معاشروں کی زندگی پر نظر ڈالیں۔ ہر جگہ جنگ اور ٹکراؤ نظر آتا ہے۔ یہ صنف اس صنف سے' یہ قوم اس قوم سے' یہ ملت اس ملت سے' یہ معاشرہ اس معاشرہ سے یہ طبقہ اس طبقہ سے برسرپیکار ہے۔

صنفی، قومی، طبقاتی اور بین الاقوامی جنگیں، حیات انسانی کی تاریخ لکھتی ہیں۔ اسی لئے ہم کہتے ہیں کہ انسان کی زندگی میں جہاد و مبارزہ سے فرار ممکن نہیں ہے۔

کہاں ہیں وہ افراد جو یہ کہتے ہیں کہ روئے زمین پر قدم رکھ کر پچاس، ستر یا سو سال یا اس سے بھی زیادہ ایک بہترین زندگی گزار سکتے ہیں۔ کھاتے سوتے آرام و آسائش سے لطف اٹھا سکتے ہیں۔ ہر قسم کی جنگ و مبارزہ سے دور، صلح و سلامتی کے ماحول میں زندگی گزار سکتے ہیں؟ کیسا سہانا سپنا ہے؟! اس خواب سے انہیں بیدار کیجئے۔ وہی شخص جو آپ کے خیال میں ۹، ۱۰ بجے صبح تک آرام کرتا رہتا ہے اس کے بعد اگر دل میں آیا تو کام پر گیا اور جی نہ چاہا تو یوں ہی پڑا رہا۔ اگر کام پر گیا بھی تو دوپہر میں بروقت گھر واپس آجاتا ہے۔ قیلولہ اپنے وقت پر کرتا ہے، رات کو بروقت سو جاتا ہے۔ خود اس شخص کے اندر بھی ایک اندرونی جنگ برپا ہے۔ جسے ہم نہیں دیکھ پاتے۔ اس کے چہرے کا اچھی طرح جائزہ لیجئے اس کے چہرہ پر ایک مجاہد و مبارز شخص کی بشاشت ہرگز نظر نہ آئے گی۔ وہ ایک چلتی پھرتی لاش ہے۔ کھاتی پیتی میت ہے، مرجھایا ہوا سراپا ہے لیکن اس کے باوجود اس کے اندر ایک دائمی جنگ جاری ہے جس سے وہ مانوس اور عادی ہو گیا ہے۔ شاید وہ خود بھی اس جنگ سے بے خبر ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ جنگ و جدال سے محفوظ ہے لیکن وہ ہمیشہ خود اپنے آپ سے جنگ و جدال میں مشغول ہے کہ میں کیوں خاموش اور ساکت بیٹھا ہوا ہوں، دوسروں سے کیوں پیچھے رہ گیا ہوں، کیا وجہ ہے کہ میرا نام و نشان کہیں نظر نہیں آتا، اس بے ثمر زندگی کا کیا فائدہ، مجھ میں کام و کوشش کی حرارت کیوں نہیں پائی جاتی؟ راحت و آرام کے یہ لمحات ان ہی سوالوں کی بھول بھلیاں میں کٹتے ہیں۔ جہاد و مبارزہ کے بغیر زندگی ممکن ہی نہیں۔ فرد اور معاشرہ کی زندگی میں، جہاد و مبارزہ کے اس قانون، اس ضرورت اور خارجی جبر سے گریز ناممکن ہے۔ وہ جبر جسے قلم

تقدیر نے انسان کی پیشانی پر لکھا ہے' اس کا واحد علاج یہ ہے کہ انسان ان مختلف قسم کی جنگوں میں سے اس جہاد کو انتخاب کر لے جو اس کے لئے زیادہ سود مند ہو اور بہتر ہو۔ جہاد و مبارزہ کو گلے سے لگائے۔ لیکن شریف جنگ' کامیاب جہاد' مفید اور ہیجان انگیز مبارزہ۔ زندہ نبرد اور اعلیٰ مقصد کی راہ میں استوار پیکار۔

کامیاب جہاد کی کچھ شرطیں ہیں ان شرطوں اور اصولوں کو سمجھ کر زندگی کی پیکار میں ان پر کاربند ہونا ضروری ہے۔

اول یہ کہ جہاد و مبارزہ کا ایک مقصد ہونا چاہئے' اور وہ بھی واضح' مشخص' صریح اور قطعی مقصد' بے مقصد جہاد کوئی معنی نہیں رکھتا۔ ہر مبارزہ کا ایک مقصد ہوتا ہے۔ لیکن کبھی کبھی مقصد واضح نہیں ہوتا۔ مبہم ہوتا ہے۔ ممکن ہے آپ کو ایسے افراد بھی نظر آئیں جنہوں نے اپنی پوری زندگی جہاد و مبارزہ میں کاٹ دی لیکن عمر کے خاتمہ پر کچھ بھی ہاتھ نہ آیا' کیوں؟ اس لئے کہ وہ اپنے جہاد کے دوران کبھی سیدھی راہ پر نہ چلے انہوں نے سعی و کوشش' محنت و مشقت ضرور کی لیکن ان کا کوئی واضح' صریح اور مشخص مقصد نہ تھا۔ ان کا رخ' مبہم اور تاریک نقطہ کی طرف تھا۔ اسی لئے ان کی تمام تر توانائیاں برباد ہوئیں اور نتیجہ خیز ثابت نہ ہو سکیں۔ قوموں کی مبارزات کی تاریخ میں اس قسم کے مبارزے بہت نظر آتے ہیں۔ شاید خود آپ لوگوں نے اپنی اور اپنی قوم کی زندگی کی تاریخ میں بھی اس قسم کے نمونے دیکھے ہوں گے یا کتابوں میں پڑھے ہوں۔ مبارزہ کا مقصد واضح' مشخص' ممتاز اور قابل شناخت ہونا چاہئے۔ جہاد کا مقصد بلند' اعلیٰ اور گراں قدر ہونا چاہئے۔ بعض اوقات آپ دیکھتے ہیں کہ مبارزہ کا مقصد واضح اور معین ہے۔ لیکن اس مقصد کی صرف اتنی اہمیت ہے کہ اس کی خاطر وقت صرف کیا جا سکتا ہے اور بس۔ اگر پیسہ بھی خرچ کرنا پڑ جائے تو قدم پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔ بعض اوقات

مقصد ذرا اس سے بھی قیمتی ہوتا ہے۔ انسان مال بھی قربان کرنے کیلئے تیار ہو جاتا ہے لیکن اگر صحت و تندرستی قربان کرنے کی بات آجائے تو جہاد سے دست بردار ہو جاتا ہے۔ بعض اوقات صحت و تندرسی بھی فدا کرنے پر تیار ہو جاتا ہے لیکن جب زندگی نثار کرنے کی ضرورت پڑ جاتی ہے تو منہ پھیر لیتا ہے۔ قدم ڈگمگانے لگتے ہیں۔ لیکن بعض اوقات جہاد کا مقصد اتنا بلند اور گراں قدر ہوتا ہے کہ انسان اس کی راہ میں اپنی اور اپنے عزیز ترین افراد کی جان کا نذرانہ پیش کرنے سے بھی گریز نہیں کرتا۔ یہی وہ قیمتی مقصد ہے جس کی طرف تمام انسانوں کو توجہ کرنی چاہئے۔ یہ اعلیٰ مقصد 'خدا کی رضا ہے۔ یہ شرط اول ہے۔

دوسری شرط یہ ہے کہ مجاہد کو مرد عمل ہونا چاہئے۔ ثابت قدم و با استقلال ہونا چاہئے:

"ان الذین قالوا ربنا اللہ ثم استقاموا تتنزل علیھم الملائکة الا تخافوا ولا تحزنوا وابشرھم بالجنة التی کنتم توعدون ' نحن اولیائکم فی الحیٰوة الدنیا وفی الاخرة ولکم فیھا ما تشتھی انفسکم ولکم فیھا ماتدعون"۔

"جو لوگ کہتے ہیں ہمارا مالک و پروردگار۔ صرف اللہ ہے اور اپنی بات پر ڈٹے رہتے ہیں اور اسی کے مطابق عمل کرتے ہیں۔ ان پر خدا کے فرشتے نازل ہوتے ہیں اور کہتے ہیں ڈرو نہیں غمزدہ مت ہو ہم تمہیں اس بہشت کی بشارت دیتے ہیں جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا' ہم دنیا و آخرت میں تمہارے مونس و مددگار ہیں۔ اس بہشت میں تمہاری خواہش کی تمام چیزیں موجود ہیں۔ سب کچھ تمہارے اختیار میں ہے"۔

"یاایھا الذین آمنوالم تقولون مالا تفعلون ۔ کبر مقتاً عنداللہ ان

تقولوا مالا تفعلون' ان الله یحب الذین یقاتلون فی سبیلہ صفاً کانھم بنیان مرصوص"۔

"اے ایمان لانے والو(اے پیغمبر کے پیچھے چلنے والو' پیغمبر تیرہ سال تک مکہ میں نعرہ توحید بلند کرتے رہے لیکن چند افراد کے سوا کسی نے ان کی آواز پر کان نہ دھرا'لیکن جب مدینہ آکر آپ نے اسلامی حکومت کی داغ بیل ڈالی اس وقت تمہارے دل اس مقصد کے پیچھے لگ گئے آگاہ رہو) ایسی باتیں کیوں کہتے ہو جن پر عمل نہیں کرتے"۔

مفسرین کہتے ہیں : کہ جب جنگ بدر کے بعد کچھ مسلمانوں نے یہ دیکھا کہ شہدائے بدر خدا' پیغمبر اور مسلمانوں کی نظر میں حد درجہ احترام رکھتے ہیں اور ان کی بڑی قدر و منزلت ہے' دنیاو آخرت کی کتنی نعمتیں انہیں نصیب ہوئی ہیں۔ دنیا میں یہ عزت اور آخرت میں اتنا عظیم ثواب ملا ہے تو کہنے لگے :"یالیتنا کنا معکم فنفوز فوزاً عظیماً"۔اے کاش ہم بھی جنگ بدر میں شریک ہوتے جہاد کرتے اور یہ عزت ہمیں بھی نصیب ہوتی۔وہی جملہ جسے آج ہم شیعہ "شہدائے کربلا کو خطاب کر کے دہراتے ہیں" :"**یالیتنا کنا معکم فنفوز فوزاً عظیماً**"۔

اتفاقاً کچھ دنوں کے بعد جنگ احد چھڑ گئی جن لوگوں کی زبان پر ہر وقت یہ جملہ رہا کرتا تھا انہوں نے پیچھے ہٹنا شروع کر دیا اور نوبت یہ آگئی کہ شہادت کے یہ خواہشمند' پیغمبر اسلامؐ اور مسلمانوں کو خطرہ میں چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ اس وقت خدا نے ان سے کہا' تمہاری آرزوئیں کیا ہوئیں کہ پھر جنگ بدر پیش آئے اور ہمیں بھی شہادت کی سعادت نصیب ہو ؟ایسی باتیں کیوں کرتے ہو جس پر عمل نہیں کرتے' خدا ان لوگوں پر غضبناک ہوتا ہے جو صرف زبانی جمع خرچ کرتے ہیں کہ ہم ہر طرح کی قربانی وجاں نثاری کیلئے تیار ہیں لیکن جب عمل کا

وقت آتا ہے تو بلوں میں گھس جاتے ہیں۔ اس طرح کے افراد قوموں کا راستہ بدل دیتے ہیں۔ قائدین کو گمراہ کر دیتے ہیں۔ حقیقی مجاہدوں کو دھوکے میں ڈال دیتے ہیں۔ مؤثر اور مفید جہاد کو ناکام و بے نتیجہ بنا دیتے ہیں۔ خدا ان لوگوں کو پسند کرتا ہے جو میدان جنگ میں دشمن کے مقابل سیسہ پلائی دیوار کی طرح ڈٹ جاتے ہیں۔ یہی وہ افراد ہیں جو جہاد کو کامیاب بنا سکتے ہیں۔

تیسری شرط جو نہایت اہم ہے اور ہمارے یہاں بہت کم نظر آتی ہے وہ جہاد کا صحیح طریقہ اور راہ عمل ہے۔ جہاد کی ایک دو قسمیں نہیں ہیں۔ اس کی بہت سی قسمیں ہیں: فردی جہاد' اجتماعی جہاد' خفیہ جہاد' علنی جہاد' پرسکون جہاد' سخت اور خشن جہاد' بغیر اسلحہ کے جہاد' اسلحہ کے ہمراہ جہاد' ٹھنڈے اسلحہ سے جہاد' گرم اسلحہ سے جہاد' میدان سے دور عارضی جہاد' میدان کے اندر جہاد' ان میں سے ہر ایک کا اپنا خاص وقت' مخصوص انداز اور یورپیوں کی اصطلاح میں ٹیکنک ہوتی ہے۔ عوام کو جہاد کے طریقہ کار سے واقف ہونا چاہئے۔ خاص طور سے انہیں جہاد اور مقصد کے درمیان پائے جانے والے رابطہ پر غیر معمولی حد تک دھیان دینا چاہئے۔ ہمارے لئے نہایت افسوس کا مقام ہے کہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ کچھ افراد خلوص دل اور صمیم قلب سے کسی مقصد کی راہ میں اپنا وقت' مال' جان' عزت و آبرو قربان کرتے ہیں لیکن غلط راستہ پر چل نکلتے ہیں۔ اپنے خیال میں وہ مقصد کی راہ میں اپنا وقت مال اور جان نچھاور کر رہے ہوتے ہیں لیکن در حقیقت ان کا راستہ غلط راستہ ہوتا ہے۔ ان کے راستہ اور ان کے مقصد کے درمیان کوئی ربط نہیں پایا جاتا ہے۔

ترسم نرسی بکعبہ اے اعرابی

این رہ کہ تو می روی بتر کستان است

"اے اعرابی مجھے خوف ہے کہ تو کعبہ تک نہ پہونچ سکے گا' کیونکہ جس

راستہ پر تو چل رہا ہے وہ ترکستان کی طرف جاتا ہے"۔

مقصد اور حرکت عملی کے درمیان ارتباط و مناسبت بہت اہم ہے' بہت سی تحریکیں صرف اسی لئے ناکام ہوئی ہیں کہ ان کی روش صحیح نہیں تھی۔ یا سرے سے روش' مقصد سے مناسبت ہی نہیں رکھتی تھی۔ ان کا جہاد انہیں مقصد سے نزدیک کرنے کے بجائے مقصد سے دور کر دیتا ہے۔

ان تین شرطوں کو مد نظر رکھتے ہوئے' اب آپ سمجھ سکتے ہیں کہ سانحہ کربلا میں کیا ہوا ہے! معاویہ مر چکا ہے۔ اعلانیہ فسق و فجور کا رسیا یزید پلید' اسلام پناہ بادشاہ اور پیغمبرِؐ خدا کے جانشین کے عنوان سے مسلمان عوام پر حکومت کر رہا ہے لیکن علانیہ شراب پیتا ہے' کھلم کھلا جوا کھیلتا ہے' اسلام کے غیر طبقاتی معاشرہ میں اسلامی دستور کے خلاف نسلی' خاندانی اور طبقاتی امتیازات کو رواج دیتا ہے یہ ہے اس کی حکومت کا نچوڑ۔

اس طرح کا شرابی' بے عقل اور نالائق شخص مسلمانوں کے تخت سلطنت پر براجمان ہے۔ کچھ جاں نثار عوام اس فاسد حکومت کو تسلیم نہیں کرتے' وہ کوشش کرتے ہیں کہ کم از کم اس حکومت کے ساتھ تعاون سے گریز کریں۔ لیکن یزید انہیں چین سے بیٹھنے نہیں دیتا۔ اپنے تمام گورنروں کو حکم دیتا ہے کہ تمام عوام' خاص طور سے ان لوگوں سے جو معاشرہ میں مشہور ہیں اور عزت کی نگاہوں سے دیکھے جاتے ہیں یزید کی بیعت یعنی اس سے تعاون کا عہد لیں۔ زادگاہ اسلام یعنی مدینہ میں کچھ مشہور و معروف شخصیتوں نے بیعت سے انکار کر دیا۔ ان میں سے ایک حسین بن علی علیہما السلام ہیں۔

اسی دوران کوفہ میں کچھ افراد اکٹھا ہوتے ہیں۔ کوفہ کیا ہے؟ کوفہ ایک اچھا اور بڑا شہر ہے۔ بڑا اس لئے ہے کہ اس میں بہت سے مذبذب' دودل اور مردّد افراد

کا ایک جم غفیر رہتا ہے۔ اچھا اس لئے کہ اس میں دبستان علیؑ کے تربیت یافتہ درخشاں ستارے رہتے ہیں اگرچہ ان کی تعداد بہت کم ہے۔ ان درخشاں ستاروں نے آپس میں یہ مشورہ کیا کہ کیا یزید کی بیعت کرنی چاہئے؟ اس کے بعد انہوں نے یہ سوال سب کے سامنے پیش کیا۔ جواب منفی تھا۔ نہیں ہرگز نہیں' یزید میں اس منصب کی قطعی صلاحیت نہیں۔ پھر کسے تلاش کریں؟ اِدھر اُدھر سے خبریں حاصل کیں' معلوم ہوا کہ سرزمین حجاز کی دو تین بلکہ کچھ زیادہ ہی شخصیتوں نے یزید کے بیعت سے انکار کر دیا ہے اور ان سب میں نمایاں ابو عبداللہ الحسینؑ بن علیؑ ہیں۔ امامؑ کے نام دعوت نامہ بھیجنا شروع کر دیا کہ آقا: آپؑ یہاں اپنے والد بزرگوار کے شہر میں تشریف لائیے۔ یہاں آپؑ کے والدؑ کا دارالخلافہ ہے۔ آیئے ہم آپ کی رکاب میں اس حکومت سے جنگ کرنا چاہتے ہیں۔ جہاد کیلئے زمین ہموار ہے۔ امامؑ کے پاس ایک خط آیا دو خط' تین خط' چار خط' دس خط' بیس خط سو خط' کسی پر ایک شخص کی دستخط' کسی پر دو کی' پانچ کی' دس کی' مختلف شہروں کے لوگوں کے خطوط کا ایک ڈھیر لگ گیا۔ یہ واقعہ تفصیل سے آپ حضرات سن چکے ہیں۔ حضرت مسلمؑ امام حسینؑ کی طرف سے کوفہ آئے تاکہ وہاں کا جائزہ لیں' امامؑ کی طرف سے لوگوں سے بیعت لیں اور امام حسینؑ کو نتیجہ سے آگاہ کریں تاکہ معلوم ہو سکے کہ اس وقت کیا کرنا چاہئے۔ امام حسینؑ کا جہاد یوں شروع ہوتا ہے۔

لیکن امام حسینؑ کا مقصد کیا ہے؟ کیا حکومت پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں؟ کیا بلاد مسلمین خاص طور سے عراق و کوفہ پر حکومت کرنا چاہتے ہیں؟ نہیں' آپ کا مقصد حکومت نہیں ہے۔ مقصد حق کا بول بالا ہے۔ حق و باطل کو پہچنوانا ہے۔ ایک واضح ترافق پر عوام کو حق و باطل سے آشنا کرانا ہے۔ حکومت ملے یا نہ ملے۔ اگر حکومت ہاتھ آگئی تو کیا کہنا' حکومت کی طاقت اللہ کی پسندیدہ راہ میں صرف کریں گے۔ اگر

حکومت نہ مل سکی پھر بھی مقصد پورا ہو جائے گا۔ کربلا میں ایسے ایسے مناظر پیش آئیں گے جنہیں تاریخ ہمیشہ کیلئے اپنے سینہ میں محفوظ کرلے گی اور مسلمانوں کا جہاد قیامت تک کیلئے حق وباطل کے درمیان معرکہ آرائی کا بہترین نمونہ بن جائے گا۔ کیا کہنا، مقصد کتنا اعلیٰ واضح ہے اور وہ بھی واضح، معین اور قاطع۔ امامؑ اس جہاد کیلئے کن فراد کو چنیں ؟ ثابت قدم افراد جو لوگ کسی اجتماعی جہاد کی قیادت کرنا چاہتے ہیں انہیں چاہئے کہ امام حسینؑ سے سبق لیں۔ امام حسینؑ جہاد کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اس جہاد میں دو قسم کے افراد کو حصہ لینا چاہئے۔ ایک تو وہ افراد جو اس جہاد کے بنیادی رکن ہیں یعنی وہ افراد جن سے جہاد کا بنیادی ڈھانچہ تشکیل پاتا ہے جہاد کی باگ ڈور جن کے ہاتھوں میں ہے۔ انھیں تجربہ کار، قابل اعتماد، مقصد کا پابند، ثابت قدم، قوی ارادہ کا مالک، اپنے فرائض سے باخبر اور قائد کا مطیع وفرمانبردار ہونا چاہئے اس کا ایک نمونہ مسلم بن عقیلؑ اور دوسرا نمونہ قیس بن مسہر صیداوی قاصد حسینؑ ہیں۔ امام حسینؑ نے ان افراد کو پوری توجہ کے ساتھ انتخاب فرمایا۔

دوسرے وہ افراد ہیں جو تحریک کے حامی ہوتے ہیں جن سے بوقت ضرورت مدد لینی چاہئے۔ ان افراد کے انتخاب میں اتنی چھان بین نہیں کی جاسکتی۔ یہ لوگ بہر حال پیچھے پیچھے آنے والے ہیں۔ اس قسم کے کچھ افراد بھی امام حسینؑ کے کارواں کے ساتھ ہولئے۔

مسلم کوفہ میں داخل ہوئے۔ کچھ حادثات رونما ہوئے۔ بہت سے افراد مسلمؑ کے اردگرد اکٹھا ہو گئے۔ کوفہ میں یزید کا والی، نعمان بن بشیر معزول ہو گیا اور اس کی جگہ ابن زیاد کوفہ کا والی بن گیا۔ وہ خونخوار، سفاک، بے ایمان، منحرف اور یزید کا فرماں بردار ہے۔ ایک نیا واقعہ پیش آتا ہے۔ مسلم کو خبر ملتی ہے کہ آپ کے میزبان ہانی بن عروہ کو دھوکا دے کر ابن زیاد کے دارالامارہ میں لے جایا گیا ہے۔ وہاں ابن زیاد

نے ان کی توہین کی ہے۔ان کے سر اور چہرہ پر چھڑی سے ضربیں لگائی ہیں۔انہیں قید کردیا ہے، مسلم نے اپنے ساتھیوں سے کہا عوام کو خبر دو مسجد کوفہ میں اکٹھا ہوں۔ مسجد اور اطراف کے بازار عوام سے چھلک رہے ہیں۔ سب کو مسلم کی تقریر کا انتظار ہے۔ دارالامارہ سے مسجد کا منظر صاف نظر آتا ہے۔ ابن زیاد کی چند دنوں کی تگ ودو کے باوجود اس کے اردگرد تیس پولیس اور ۱۲۰ موری حامیوں کے سوا کوئی نہیں ہے۔ ابن زیاد اور اس کے پچاس ساتھی، دارالامارہ سے مسجد کا منظر دیکھنے کیلئے اوپر آتے ہیں۔ عوام ابن زیاد اور اس کے حواریوں کو دیکھتے ہی ان کے خلاف نعرے لگانا ان پر پتھروں کی بارش کرنا اور یزید کی حکومت کو برا بھلا کہنا شروع کردیتے ہیں۔ یہ ہے آٹھ ذی الحجہ کو کوفہ میں مسلم اور اور ابن زیاد کی حالت۔

ابن زیاد بغور حالات کا جائزہ لیتا ہے۔ مکروفریب کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے اپنے افراد کو بھیجتا ہے اور وہ مختلف بہانوں سے ایک ایک دو دو کر کے لوگوں کو مسجد سے باہر لے جاتے ہیں۔ماں اپنے بچہ کو لے جاتی ہے۔باپ اپنے بیٹے کو لے جاتا ہے، سسر داماد کو لے جاتا ہے۔ چچا بھتیجے کو لے جاتا ہے۔ ہر شخص کسی نہ کسی عنوان سے، کسی کو لالچ اور کسی کو دھمکی دے کر لے گئے۔ نماز مغرب کے وقت جب مسلم نے نماز پڑھنی چاہی تو صرف تیس افراد نے ان کی پیچھے نماز پڑھی۔ نماز کے بعد جب مسلم نے مسجد سے باہر نکلنا چاہا تو دیکھا کہ ایک شخص بھی باقی نہیں رہا ہے۔ گھر کا پتہ بھی ٹھیک سے معلوم نہیں کوفہ کی گلیوں سے بھی اچھی طرح واقف نہیں۔ غریب الوطنی اور یکہ و تنہا، کوئی نہیں جو راستہ بتائے یہ وہی کوفہ کے مذبذب و بے قیمت افراد تھے۔ یہ لوگ اس لائق نہیں ہیں کہ ان پر بھروسہ کر کے جہاد کیا جائے۔ یہ لوگ بے ثباتی کا نمونہ ہیں۔

امام حسینؑ مسلم کے خط کی روشنی میں مکہ سے روانہ ہوتے ہیں۔ راستہ میں

بہت سے لوگ کارواں کے ساتھ ہو گئے۔ چلتے چلتے عراق کے قریب پہنچ گئے۔ وہاں آپؑ کو خبر ملی کہ کوفہ کے حالات وہ نہیں جس کی اطلاع مسلم نے دی تھی، حالات بدل چکے ہیں۔ مسلم شہید ہو چکے ہیں۔ ہانی بن عروہ درجۂ شہادت پر فائز ہو چکے ہیں۔ آپ کے نامہ رساں عبداللہ بن یقطر جام شہادت نوش کر چکے ہیں لیکن ان وحشتناک خبروں کے باوجود حسینی جہاد نہیں رکا۔ صرف روش اور حکمت عملی میں تبدیلی آئی۔ کیونکہ حالات بدل چکے تھے۔ حضرتؑ نے اپنے تمام ساتھیوں کو اکٹھا ہونے کا حکم دیا۔ مجمع میں آکر آپ نے ایک نوشتہ پڑھ کر سنایا اور پھر خدا کی حمد و ثنا کے بعد فرمایا: آگاہ ہو جاؤ کہ کوفہ سے وحشتناک خبریں آرہی ہیں۔ مسلم، ہانی اور عبداللہ بن یقطر کو قتل کر دیا گیا ہے۔ لوگوں نے ہم سے خیانت کی ہے۔ ہم اس جادہ پر چلتے رہیں گے یہاں تک کہ قتل کر دیئے جائیں۔ تم میں سے جو شخص مال و منال کی امید، آرام دہ زندگی کی خواہش، مقام و منصب کی لالچ میں ہمارے ساتھ آیا ہے وہ واپس چلا جائے۔ کچھ لوگ چلے گئے اکثر وہ افراد جو راستہ میں کارواں کے ساتھ ہو گئے تھے چلے گئے۔

اب حسینؑ بن علیؑ رہ گئے، مدینہ سے آنے والے خدام اور راستہ میں ساتھ ہونے والے کچھ دوست چونکہ جہاد کا منظر بدل گیا ہے لہٰذا مذبذب اور ڈھل مل یقین افراد حسینی خیمہ میں باقی نہ رہے۔ چونکہ جہاد کی روش بدل چکی ہے۔ لہٰذا صرف پاک سیرت تجربہ کار افراد ہی کو آپ کے ساتھ رہنا چاہئے۔ صرف وہی پاک و منزہ افراد اس راہ میں قدم رکھیں جو جہاد کربلا کے مقصد پر بھرپور ایمان رکھتے ہوں۔ اور ایثار و جاں نثاری کیلئے آمادہ ہوں۔

ایک چیز جو جہاد میں بہت اہمیت رکھتی ہے وہ صحیح اور قابل اعتماد مواصلاتی ذریعہ ہے۔ اسے مومن، تجربہ کار اور بامقصد افراد سے تشکیل پانا چاہئے۔ قیس بن

مسہر اس قیمتی مواصلاتی ٹیم کا ایک نمونہ ہیں۔ حسینؑ بن علیؑ کا پیغام کوفہ کے عوام تک پہچانا ان کا فریضہ ہے۔ خط لے کر کوفہ کی طرف روانہ ہوتے ہیں۔ قادسیہ کے قریب ابن زیاد کا کارندہ حصین بن نمیر انہیں قید کر کے ابن زیاد کے پاس بھیج دیتا ہے۔ ابن زیاد ان سے کہتا ہے اگر جان بچانا چاہتے ہو تو منبر پر جاکر حسینؑ بن علیؑ کو گالی دو۔ قیس منبر پر جاکر عوام سے خطاب کرتے ہیں: خدایا تیرا شکر' ایھاالناس! یہ حسینؑ بن علیؑ مخلوقات خدا میں سب سے افضل ہیں' وہ رسولؐ خدا کی بیٹی فاطمہؑ کے فرزند ہیں۔ انہوں نے مجھے بھیجا ہے کہ یہ پیغام تم لوگوں تک پہنچادوں' راہ راست پر اٹھ کھڑے ہو' ان کی مدد کرو۔ اس کے بعد قیس نے علیؑ اور حسینؑ بن علیؑ کی ارواح طیبہ پر درود بھیجا اور معاویہ' یزید اور ابن زیاد پر لعنت بھیجی اس طرح اپنا فریضہ منصبی پورا کیا۔ عبیداللہ۔ ز قیس کو منبر سے نیچے لانے کا حکم دیا۔ انہیں منبر سے کھینچ کر دارالامارہ کی چھت سے نیچے پھینک دیا گیا۔ وہ شہید ہو گئے۔

حسینؑ ابن علیؑ اس قسم کے افراد کے ہمراہ کوفہ کی طرف چلے تھے۔ راستہ میں حر سے ملاقات ہو گئی۔ راستہ بدل لیا' ایک ایسی سمت روانہ ہوئے جو نہ مدینہ کی طرف جاتی ہو اور نہ کوفہ کی طرف۔ مدینہ سے مکہ اور مکہ سے کربلا تک سفر میں جو واقعات پیش آئے انھیں آپ نے ملاحظہ فرمایا' مقصد واضح اور مشخص ہے۔ خدا' مرضئ خدا' دین اور حق و حقیقت کا دفاع' روش و اسلوب بھی واضح ہے۔ حسینؑ بن علیؑ جانتے ہیں کہ انہیں اس راستہ پر چلنا ہے جہاں سے واپسی ناممکن ہے اگر آپ راستہ میں' حتی عاشور کے دن عوام اور ابن زیاد کے کارندوں کے سامنے یہ تجویز رکھتے ہیں کہ اگر کوفہ کے عوام اپنے شہر میں میرا آنا پسند نہیں کرتے تو میں واپس چلا جاتا ہوں تو اس کی کچھ دوسری وجوہات تھیں' ورنہ اثنائے سفر میں امامؑ بار بار یہ فرما چکے تھے کہ ہم جس راستہ پر چل رہے ہیں اس سے واپسی ممکن نہیں ہے۔ امام

منزل قصر بنی مقاتل سے نکل کر آگے بڑھ رہے ہیں۔ ابھی ابن زیاد کے نام حر کے خط کا جواب نہیں پہنچا ہے اور حالات واضح نہیں ہوئے ہیں۔ عقبہ بن سمعان کہتے ہیں: میں امامؑ کے قریب تھا۔ کیا دیکھا کہ امام کو گھوڑے ہی پر نیند آگئی اچانک آپ کی آنکھ کھلی اور فرمایا: **انا لله وانا الیه راجعون والحمدلله رب العالمین** ۔ آپ نے یہ جملہ تین بار دہرایا۔ آپ کے لخت جگر علی اکبرؑ نے جب یہ جملہ سنا، خدمت میں حاضر ہو کر عرض کی بابا: یہ کیا آپ کلمہ استرجاع پڑھ رہے ہیں ؟ فرمایا: بیٹا ابھی آنکھ لگ گئی تھی۔ خواب میں ایک سوار کو یہ کہتے دیکھا کہ یہ لوگ جا رہے ہیں اور موت ان کے پیچھے پیچھے آ رہی ہے۔ ایسے میں علی اکبرؑ کو کیا کہنا چاہئے؟ عرض کی: بابا! کیا ہم حق پر نہیں ہیں ؟ آپؑ نے فرمایا: کیوں نہیں۔ عرض کیا: پھر ہمیں موت کا کیا خوف! ہم زندگی کے آخری لمحات تک حق سے منہ نہ موڑیں گے یہی نہیں بلکہ ہم موت کا استقبال کرتے ہیں۔ اسی قسم کے افراد حسینؑ کے ساتھ آئیں۔

حضرتؑ نے خاک کربلا پر قدم رکھنے سے پہلے بارہا فرمایا تھا کہ ہم موت کو گلے لگانے جا رہے ہیں۔ ضروری تھا کہ لوگوں کو سمجھا دیں کہ ہم کوفہ کی حکومت کیلئے نہیں آئے ہیں، کل لوگ یہ نہ کہیں کہ: کوفیوں نے آپؑ کو کوفہ آنے کی دعوت دی تھی۔ جب آپ نے یہ دیکھا کہ حکومت ہاتھ نہیں آسکتی تو آپؑ کی غیرت پر چوٹ لگی لہٰذا آپؑ نے موت کو زندگی پر ترجیح دی۔ کیونکہ آپ حکومت سے محرومیت کی تلخی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ اسی شبہ کو دور کرنے کی خاطر حضرت نے بارہا یہ کہا کہ اگر تم نہیں چاہتے ہو تو میں واپس چلا جاتا ہوں۔ یہ مت سمجھو کہ میری غیرت کو ٹھیس پہنچی ہے اور چونکہ حکومت سے محروم رہ گیا ہوں لہٰذا اب مجھ میں زندہ رہنے کی تاب نہیں رہ گئی ہے اور خودکشی کیلئے یہاں آیا

ہوں۔ آپ نے یہ بات بارہا کہی تاکہ کوئی شخص آپ کے بارے میں ولا تلقوا بایدیکم الی التھلکة کی آیت نہ پڑھے۔ تاریخ آپ کے اس مکرر جملہ کو اپنے دامن میں محفوظ کرلے تاکہ واقعۂ کربلا کی صحیح تفسیر ہوسکے۔ اس مدیت میں عاشور تک پیش آنے والے تمام واقعات حتیٰ جزئی و معمولی ترین واقعات میں بھی یہ نکتہ بخوبی نمایاں ہے کہ امام چاہتے ہیں کہ سپاہ دشمن کے مؤرخوں کی تمام تحریفوں اور دست کاریوں کے باوجود واقعۂ کربلا میں سے جو کچھ بچ رہے وہ آنے والی نسلوں کیلئے سبق آموز ہو۔ عاشور کے دن جب حضرت صف آرائی کرلیتے ہیں اور جنگ یقینی ہو جاتی ہے تو آپؑ خیموں کو یکجا کرنے کا حکم دیتے ہیں۔ خیموں کے پیچھے خندق میں لکڑی بھر دی جاتی ہے اس کے بعد حضرت اس میں آگ روشن کرنے کا حکم دیتے ہیں تاکہ دشمن پیچھے سے حملہ نہ کرسکے۔ اس کے بعد آپ نے بہتر افراد پر مشتمل اپنی فوج منظّم فرمائی اور اس دور کے فوجی نظام کے مطابق میمنہ' میسرہ' قلب اور علمدار معین فرمایا۔ جس وقت امام حسینؑ اپنی فوج کو منظّم فرمانے میں مشغول تھے' سپاہ دشمن کے کچھ سواروں نے لشکر حسینؑ پر پیچھے سے حملہ کا منصوبہ بنایا۔ ان میں سے ایک یا ان کا سرغنہ شمر تھا۔ مگر ان لوگوں نے دیکھا پیچھے ایک عجیب خندق موجود ہے۔ گویا ایک بڑی جنگ ہونے والی ہے جس کیلئے خندق اور آگ فراہم کی گئی ہے۔ حسینؑ بن علیؑ کے کام میں اس دقیق نظم سے انہیں بڑا غصہ آیا۔ شمر نے چلا کر کہا: ''جو آگ قیامت کے دن تمہاری منتظر ہے اسے تم نے دنیا ہی میں خود اپنے ہاتھوں اپنے لئے فراہم کرلیا ہے'' یہ جملہ زہر آگین تیر کی طرح حسینؑ کے شیدائیوں کے دل میں اترا۔ مسلم عوسجہؓ نے عرض کیا: ''آقا! اجازت دیجئے میں اس خبیث کو یہیں سے تیر مار کر ہلاک کئے دیتا ہوں''۔

غور کیجئے امامؑ نے فرمایا:

"نہیں، میں جنگ شروع کرنے کیلئے تیار نہیں ہوں تاکہ پوری دنیا جان لے کہ میں اسی پیغمبرؐ کے نقش قدم پر چل رہا ہوں جس کی تمام جنگیں اسلام سے دفاع کی شکل رکھتی تھیں۔ تاکہ کسی میں یہ کہنے کہ جرأت نہ ہو کہ پیغمبرؐ اور ان کے اہل بیتؑ تلوار کے زور پر اپنی بات منوانا چاہتے تھے۔ دنیا یہ جان لے کہ میں نے جنگ کا آغاز نہیں کیا ہے"۔

امامؑ نے فرمایا نہیں تم تیر نہ مارو۔ ان ہی کو جنگ شروع کرنے دو۔ امام نے اپنی سپاہ منظّم کرنے کے بعد فرمایا میں ہر کام سے پہلے ان لوگوں سے گفتگو کرلوں، گھوڑے پر سوار ہوکر پوری شان و شوکت کے ساتھ دشمن کی فوج کے سامنے آئے۔ بلند آواز سے لوگوں کو خاموش رہنے اور بات سننے کی دعوت دی۔ سب خاموش ہوگئے۔ آپ نے اپنا خطبہ شروع کیا۔ آپ کے اس خطبہ کے دو تین جملے بہت عمدہ ہیں۔ ایک یہ کہ آپؑ نے فرمایا:

"اے لوگو! اگر مجھے نہیں پہچانتے تو ان لوگوں سے پوچھو جو تمہارے درمیان موجود ہیں اور پیغمبرؐ کے اہل بیتؑ سے واقف ہیں۔ کیا تم جانتے ہو کہ میں پیغمبرؐ خدا کا فرزند ہوں؟"۔

حسینؑ بن علیؑ روزِ عاشورا میدان کربلا میں اپنے کو کیوں پہچنوا رہے تھے؟ تاکہ کل یہ خائن اور منافق عوام یہ نہ کہیں کہ ہمیں نہیں معلوم تھا، ابن زیاد نے ہمیں دھوکا دیا ہم سمجھتے تھے یہ کوئی اور شخص ہے۔ اگر ہمیں معلوم ہوتا کہ یہ وہی حسینؑ بن علیؑ ہیں جنھیں ہم نے دعوت دی ہے تو ہم ہرگز ان سے جنگ نہ کرتے بلکہ ان کی مدد بھی کرتے۔ قارئین اس نکتہ پر تعجب نہ کریں، کیونکہ آپ بار بار دیکھ چکے ہیں کہ حقیقتوں کو کس طرح توڑ مروڑ کر عوام کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔ اس دور میں جب روابط و تعلقات کم تھے۔ عوام کو حقائق سے باخبر کرنے کے وسائل بہت محدود تھے جن کے

ہاتھوں میں حکومت ہوتی تھی سارے وسائل کے وہی مالک ہوتے تھے۔ اس زمانہ میں حقائق کو اس حد تک مسخ کرنا بڑا آسان کام تھا۔ معاویہ نے شام میں حضرت علیؑ کی کیسی تصویر پیش کی تھی؟ پھر کونسی تعجب کی بات ہے کہ حسینؑ کو اس بات کی فکر ہو کہ کہیں یہ لوگ کل یہ نہ کہیں کہ اگر حسینؑ اپنے کو پہچنواتے' اگر ہمیں پتہ چل جاتا کہ یہ مسافر حسینؑ بن علیؑ ہیں جنھیں ہم نے دعوت دی تھی تو ہم ان کی حمایت کرتے۔ لہٰذا آپؑ نے اپنا تعارف کرایا اس کے بعد فرمایا:

"اے لوگو! جو یہاں آئے ہو! کیا تم نے مجھے دعوت نہیں دی تھی وہ دعوت کیسی تھی اور یہ تمہارا آنا کیسا ہے؟ کیا تمہاری دعوت اور آمد کے دوران مجھ سے کوئی خطا سرزد ہوئی ہے جس سے میرا خون مباح ہو جائے؟ کیا میں نے تمہارے کسی عزیز کا خون بہایا ہے؟ کیا میں نے تمہارا مال و منال لوٹا ہے؟ کیا کسی حلال کو حرام کیا ہے؟ کسی حرام کو حلال کیا ہے؟ تم کس لئے میرا خون مباح سمجھتے ہو اور مجھ سے جنگ کرنے آئے ہو؟"۔

آپؑ نے یہ سب باتیں کہیں تاکہ کل کوئی کوفہ کے مذبذب عوام کے جرم کی توجیہ نہ کر سکے اور یہ نہ کہے کہ جو شخص بھی حکومت وقت کے خلاف قیام کرے وہ خارجی ہے اور اس کا خون مباح ہے۔

امام حسینؑ کے واقعہ میں خود عوام نے امامؑ کو دعوت دی تھی۔ حضرت یہ سمجھانا چاہتے تھے کہ تم لوگوں نے خود ہی مجھے دعوت دی تھی اور میں نے تمہاری دعوت قبول کرلی۔ تم نے کہا تھا دین خدا پامال ہو رہا ہے' میں دین خدا کو بچانے کیلئے تمہاری سرزمین پر آیا ہوں۔ تم تاریخ کو کیا منہ دکھاؤ گے' کس طرح سر اٹھا کر کہہ سکتے ہو کہ ہم نے حسینؑ کو دعوت دی اور مل جل کر انھیں کربلا میں شہید کردیا۔

یہ واقعۂ کربلا کے اہم سبق آموز اور قابل توجہ نکتے ہیں۔

انقلاب کربلا
ایک تاریخی جائزہ

مقالہ نگار: رسول جعفریان

سن ۶۰ ہجری میں معاویہ کی ہلاکت کے بعد' یزید طے شدہ منصوبہ کے مطابق خلافت پر بیٹھا یہ خبر ابھی مدینہ نہیں پہنچی تھی' یزید اپنی پوری طاقت ان مخالفین سے بیعت لینے پر صرف کر رہا تھا' جنکی مخالفت شورش وانقلاب کا باعث ہو سکتی تھی۔ (دینوری' اخبار الطوال ص ۲۲۷)

یزید نے مدینہ میں اپنے گورنر (ولید بن عتبہ بن ابی سفیان) کو لکھا کہ جس قدر جلد ہو سکے عبداللہ بن زبیر اور حسینؑ بن علیؑ سے میری بیعت لے لے۔ مروان نے ولید کو آمادہ کیا کہ اسی شب اپنے آدمی ان دونوں کے یہاں روانہ کرو اور اگر یہ لوگ بیعت نہ کریں تو فوراً ان کی گردنیں اڑادی جائیں' کیونکہ اگر یہ رات گزر گئی تو دوسرے ہی دن یہ مخالفت پر اتر آئیں گے اور لوگوں کو اپنی جانب دعوت دینے لگیں گے۔ (ابن اعثم ج ۵' ص ۱۱)

جس وقت والی مدینہ کا قاصد امام حسینؑ کے پاس آیا تو فوراً امامؑ کا ذہن معاویہ کی موت کی طرف متوجہ ہوا کیونکہ آپ معاویہ کے بڑھاپے اور عرصہ سے اس کی بیماری سے واقف وباخبر تھے۔ لہٰذا آپؑ اپنے چند مخصوص مسلح اصحاب کے ساتھ

حاکم مدینہ کے محل میں تشریف لائے تاکہ یہ لوگ کسی خطرناک صورت حال میں امامؑ کو قتل سے محفوظ رکھ سکیں۔ وہاں پہلے امامؑ نے یہ فرمایا کہ مجھ جیسے شخص کیلئے مناسب نہیں ہے کہ چھپ کر خاموشی سے بیعت کرلے بلکہ یہ بیعت بھرے مجمع میں مسجد نبیؐ میں ہونی چاہئے۔ "ولید" نے امامؑ کی بات مان لی لیکن مروان نے دھمکی بھرے ہوئے جملوں کے ذریعہ ولید کو امام کے اسی وقت گرفتار کرنے پر آمادہ کرنا چاہا' امامؑ نے بھی وہاں سے باہر نکلتے ہوئے ولید کی طرف رخ کرکے مروان سے زیادہ تند لہجہ میں فرمایا:

"ایھا الامیر انا اھل بیت النبوۃ ومعدن الرسالۃ ومختلف الملائکۃ و محط الرحمۃ بنافتح اللہ وبنا ختم ویزید رجل فاسق شارب الخمر قاتل النفس المحترمۃ ' معلن بالفسق ومثلی لا یبایع مثلہ"۔ (ابن اعثم کوفی' ج ۵' ص ۱۷)

"اے امیر! ہم اہل بیت نبوتؐ' معدن رسالت' محل رفت و آمد ملائکہ اور جائگاہ رحمت ہیں' خداوند عالم نے ہمیں سے آغاز کیا اور ہمیں پر خاتمہ ہے اور یزید فاسق' شراب خوار' قاتل نفسِ محترم اور کھلم کھلا فسق وفجور کرنے والا شخص ہے اور مجھ جیسا شخص اس جیسے کی بیعت نہیں کرے گا"۔

اس نشست میں امام علیہ السلام سے بیعت لینے کے سلسلہ میں مروان کے اصرار کے بعد امامؑ نے فرمایا: وعلی الاسلام السلام......اور آیہ تطہیر کے ذریعہ استدلال کرتے ہوئے خلافت کیلئے اہل بیت علیہم السلام کی لیاقت وشائستگی کا اعلان فرمایا۔ (ابن اعثم کوفی' ج ۵' ص ۲۴۔۲۵)

دوسرے روز عبداللہ بن زبیر مدینہ میں نہیں تھے' مامورین حکومت ان کی تلاش میں لگے ہوئے تھے۔ اس کے ایک شب بعد امام حسینؑ نے بھی مدینہ کو

ترک کر دیا۔ (دینوری 'گزشتہ ص ۲۲۸)

اس سفر میں اہل بیتؑ کے تقریباً تمام افراد امام کے ہمراہ تھے' البتہ محمد بن حنفیہ مدینہ میں رہ گئے تھے۔ امام حسینؑ کی مدینہ سے روانگی کی تاریخ ۳ / شعبان ☆ ذکر ہوئی ہے۔ جب امامؑ مکہ میں وارد ہوئے تو اہل شہر بے حد شاد و مسرور ہوئے' یہاں تک کہ ابن زبیر جو خود بھی خلافت کے دعویدار تھے' امامؑ کی نماز اور ان کی بزم حدیث میں شریک ہوتے تھے۔ (ابن اعثم 'ج ۵ ص ۴۹۔ ۵۰)

مکہ اسلام کا دینی مرکز تھا اور فطری طور سے بہت سے لوگ کھینچ کھینچ کر وہاں آتے تھے' لہٰذا وہاں امام مختلف شخصیتوں سے ملتے رہتے اور ان سے یزید کی بیعت نہ کرنے کے اسباب و علل بیان فرمایا کرتے تھے۔ شیعیان کوفہ یزید سے امامؑ کی مخالفت اور ان کی مکہ تشریف آوری کی خبر سن کر بے حد خوش ہوئے کیونکہ وہ اس دن کا مدتوں پہلے سے انتظار کر رہے تھے۔ ان لوگوں نے امام حسنؑ کی شہادت کے بعد ہی امامؑ کی خدمت میں دعوت نامہ روانہ کیا تھا' لیکن امامؑ نے اسے قبول نہیں فرمایا تھا۔ لہٰذا اب انہوں نے ایک جلسہ کیا اور اس میں کوفہ کے کئی سربر آوردہ افراد منجملہ ان میں سلیمان بن صرد اور ...... وغیرہ نے تقریریں کیں اور اس میں امام علیہ السلام کو عراق بلانے کا مسئلہ اٹھایا گیا۔ سب نے اس کی موافقت کی' سلیمان نے اس پر سب سے عہد لیا کہ کہیں بعد میں مکر نہ جائیں۔ سب نے وفاداری کا عہد کیا۔ (طبری 'ج ۵ 'ص ۱۲۶۱۔ ۲۶۰۔ ابن اعثم ج ۵ 'ص ۴۶ یہ اقدام اس شہرت کی بنا پر تھا کہ ان لوگوں نے حضرت علیؑ اور ان کے فرزند حضرت حسنؑ کی حمایت سے گریز کیا تھا۔ لہٰذا ان سے وفاداری کا عہد لیا جا رہا تھا۔)

اس کے بعد شیعوں کے چند سرکردہ افراد منجملہ سلیمان' مسیّب بن نخبہ'

☆۔ ۳' شعبان کو آپ مکہ معظمہ میں وارد ہوئے ہیں' مدینہ سے روانگی ۲۸ / رجب کو ہوئی تھی۔

حبیب بن مظاہر، رفاعۃ بن شداد، عبداللہ بن وائل نے امامؑ کی خدمت میں خط لکھا اور انہیں کوفہ تشریف لانے کی دعوت دی۔

امامؑ نے اس خط کے جواب میں کسی رد عمل کا اظہار نہیں کیا۔ کچھ عرصہ کے بعد دوسرے خطوط بھی پے در پے امامؑ کی خدمت میں پہنچتے رہے، قیس بن مسہر صیداوی اور عبداللہ بن وائل وغیرہ بھی مکہ میں امامؑ کے پاس آئے اور خطوط کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ حالات کچھ ایسے ہوگئے تھے کہ اب سکوت و بے توجہی مناسب نہیں تھی۔ ہانی بن عروہ جو ان میں کی ایک اہم فرد تھے انہوں نے عوام، حتی کوفہ کے اشراف کی موجودگی اور ان کی بھرپور آمادگی کا تذکرہ کیا اور خطوط کے مضمون کی پُر زور الفاظ میں تائید کی۔ (ابن اعثم، ج ۵ ص ۴۹۔ ۵۰)

اس کے جواب میں امامؑ کا سب سے پہلا اقدام یہ تھا کہ آپؑ نے حضرت مسلمؑ کو کوفہ کی جانب روانہ کیا۔ حضرت مسلمؑ کے سفر کے سلسلہ میں ضروری وضاحت ہم آگے ذکر کریں گے۔ امامؑ نے ان کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ:

"وان رأیت الناس مجتمعین علیٰ بیعتی فالعجل لی بالخیر حتیٰ اعمل علیٰ حسب ذالك"۔ (ابن اعثم، ج ۵ ص ۵۳)

"اگر تم دیکھو کہ تمام لوگ میری بیعت پر مائل نظر آتے ہیں تو جلدی سے مجھے اس کی خبر دو تاکہ میں اس کے مطابق عمل کروں"۔

جواب مثبت تھا، مسلم نے لوگوں کے ہجوم کو امامؑ کی بیعت پر آمادہ دیکھ کر لکھا کہ: "بیس ہزار سے زیادہ افراد نے آپؑ کی بیعت کی ہے، جیسے ہی یہ خبر آپؑ تک پہنچے آپ فوراً اقدام فرمائیے"۔ (ابن اعثم، ج ۵، ص ۱۵۰)

اب چونکہ امامؑ کے حقیقی نمایندہ نے اہل کوفہ کی آمادگی کی تائید کردی تھی، لہذا اب تأمل کی گنجائش نہیں تھی۔ کیونکہ ان تمام خطوط اور جناب مسلمؑ کے خط کو

دیکھتے ہوئے پورے اطمینان سے یہ بات کہی جاسکتی تھی کہ بنوامیہ کے خلاف قیام کرنے کے حالات پیدا ہوگئے ہیں۔ امامؑ نے بہ عجلت روانگی کا اقدام فرمایا یعنی ۸ ذی الحجہ کو عین مراسم حج کے دوران عازم سفر ہوئے۔ کیونکہ ایک لحظہ کی تاخیر بھی عراق میں تغیر و تبدل پیدا کرسکتی تھی۔

کہا جاتا ہے کہ امامؑ کے ہمراہ انے والوں کی تعداد ۸۰ اسّی تھی لیکن آئندہ ذکر ہونیوالی روایتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپؑ کے ہمراہیوں کی تعداد اس سے زیادہ تھی۔ اور احتمال یہ ہے کہ یہ (اسّی ۸۰ افراد) وہ افراد تھے جو کربلا تک امامؑ کے ساتھ ساتھ رہے۔

اس سفر میں امام کی پہلی مڈبھیڑ ایک قافلہ سے ہوئی جو یمن سے شام کی طرف جارہا تھا یہ قافلہ یزید کے دربار کیلئے ہدیے اور تحفے شام لے جارہا تھا۔ امامؑ نے اس قافلہ اور تحائف پر قبضہ کرلیا اور قافلہ والوں کو بھی دعوت دی کہ اگر چاہیں تو ان کے ہمراہ عراق چلیں یا پھر واپس پلٹ جائیں۔

(بلاذری' انساب الاشراف ج ۲' ص ۱۶۴ تصحیح معموری' دینوری ص ۲۴۵'
طبری ج ۴ ص ۲۸۹۔۲۹۰)

یہ قافلہ آپ کو تنعیم کے علاقہ میں ملا تھا۔ وہاں سے آپؑ الصفاح پہنچے جہاں آپؑ کی ملاقات فرزدقؔ سے ہوئی۔ فرزدق نے کہا کہ :"قلوب الناس معك وسیوفهم علیك"۔ "لوگوں کے دل آپؑ کے ساتھ ہیں لیکن ان کی تلواریں آپؑ کے خلاف ہیں"۔

اگلی منزل بطن الرمۃ تھی۔ یہاں آپؑ نے اہل کوفہ کو ایک خط تحریر فرمایا اور اس میں جناب مسلمؑ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا کہ لوگ میرے آنے کے منتظر رہیں۔ (دینوری ص ۲۴۵)

یہ خط قیس بن مسہر کے ذریعہ روانہ کیا گیا جو حصین بن نمیر کی فوج کے ہاتھوں گرفتار کر لئے گئے۔ قیس نے اسی وقت خط نگل لیا اور اس کے بعد کوفہ میں ابن زیاد کے ہاتھوں شہید کر دیئے گئے۔ اگلی منزل زرود پر امامؑ کی ملاقات زہیر بن القین سے ہوئی۔ اگر چہ زہیر عثمان کے دوستداروں میں سے تھے لیکن امامؑ کی دعوت اور زوجہ کی تحریک پر امامؑ کے گہرے دوستدار بن گئے۔ انہوں نے اپنے ساتھیوں سے بھی کہا کہ جسے شہادت پسند ہو وہ میرے ساتھ چلا آئے اور جسے جانا ہو وہ بخوشی مکہ کی جانب اپنا سفر جاری رکھے۔ (دینوری ص ۲۴۷)

ذات العرق کی منزل تھی جب بنو اسد کے ایک شخص نے امام حسینؑ کو ہانی اور مسلم کی شہادت کی خبر دی۔ (ابن اعثم ج ۵ ص ۱۲۰)

کہا جاتا ہے کہ امامؑ نے واپسی کا ارادہ کیا لیکن مسلم کے بھائیوں نے آپؐ کو روکا' لہٰذا آپ نے بھی اپنا سفر جاری رکھا۔ لیکن یہ بعید ہے کہ مسلم کے بھائیوں نے امامؑ کی مخالفت کی صورت میں آپؐ پر کوفہ چلنے کیلئے دباؤ ڈالنا چاہا ہو یا آمادہ کرنے کی کوشش کی ہو۔ خاص طور سے جب دوسروں نے آپؐ کو کوفہ چلنے پر آمادہ کرنے کیلئے کہا:

"واللہ ماانت مثل مسلم بن عقیل ولو قدمت الکوفه لکان الناس الیك اسرع"۔ (طبری ج ۴ ص ۳۰۰)

"آپ مسلم نہیں ہیں' جیسے ہی آپ کوفہ میں داخل ہوں گے تو تیزی سے آپؐ کی طرف آجائیں گے"۔

ظاہر ہے کہ اس جملہ سے ان لوگوں کا مقصد کیا تھا۔ زبالہ کے علاوہ میں حضرت مسلم کا آخری پیغام امامؑ کو ملا۔ جو مسلمؑ نے شہادت کے وقت عمر بن سعد سے کہا تھا اور اس سے خواہش ظاہر کی تھی کہ یہ پیغام حسینؑ تک پہنچا دے۔

(حضرت مسلم کا پیغام یہ تھا کہ امام حسینؑ جس قدر جلد ممکن ہو حجاز کی جانب واپس پلٹ جائیں)۔

ابھی کچھ اور آگے بڑھے تھے کہ قیس بن مسہر اور امام حسینؑ کے رضائی بھائی عبداللہ بن یقطر کی شہادت کی خبر بھی امامؑ کو ملی۔ ان خبروں سے صاف پتہ چل رہا تھا کہ کوفہ کے حالات دگرگوں ہو چکے ہیں اور مسلم کے ذریعہ جن حالات کی اطلاع ان تک پہنچی تھی' اب اس میں کافی فرق آگیا ہے۔

(دینوری ص ۲۴۷' ۲۴۸)

اس موقع پر امام نے اپنے اصحاب اور ہمراہیوں سے فرمایا:

"ایھاالناس قد خذلتنا شیعتنا فمن ارادمنکم الانصراف فلینصرف"۔ (بلاذری ص ۱۶۹)

"اے لوگو! ہمارے شیعوں نے ہمیں تنہا چھوڑ دیا ہے' اب تم میں سے جو اپنے ارادہ سے منصرف ہونا چاہتا ہے اور جانا چاہتا ہے تو یہیں سے واپس چلا جائے"۔

امامؑ کے اس ارشاد کے بعد وہ لوگ جو درمیان راہ سے امامؑ کے ہمراہ ہو لئے تھے اپنی اپنی راہ ہو لئے اور فقط امام کے وہ خاص اصحاب جو مکہ یا مدینہ سے امام کے ساتھ ساتھ تھے باقی رہے۔

(بلاذری' ص ۱۶۹' طبری ج ۴ ص ۳۰۰۔۳۰۱' دینوری ص ۲۴۸)

جو لوگ یہاں امامؑ سے جدا ہوئے تھے اعرابی تھے' وہ یہ سوچ کر امامؑ کے ہمراہ ہو گئے تھے کہ حسینؑ بن علیؑ اس شہر کی طرف لے جا رہے ہیں جہاں سب کے سب آپ کے تابع فرمان ہیں لیکن اب جبکہ انہیں یہ معلوم ہوا کہ ان کا خیال غلط تھا تو وہیں سے امام کا ساتھ چھوڑ کر چلے گئے۔ (طبری' ج ۴ ص ۳۰۰)

امامؑ نے اپنا سفر جاری رکھا۔ یہاں امام پر یہ بات پوری طرح روشن ہو چکی تھی کہ اب کوفہ جانا سیاسی اعتبار سے بالکل درست نہیں ہے۔ اس کے علاوہ دوسرے وجوہات بھی تھے جنہیں سیاست سے الگ ہٹ کر سمجھنا چاہئے۔

امامؑ شراۃ کے علاقہ کی طرف روانہ ہوئے۔ شب میں وہیں قیام کیا اور دوسرے روز پھر روانہ ہوئے تقریباً ظہر کا وقت تھا کہ دور سے ابن زیاد کا لشکر حر بن یزید ریاحی کی سرداری میں آتا ہوا نظر آیا۔ حُر اس وقت خود کو صرف ایک سردار لشکر کی حیثیت سے ابن زیاد کا کارگزر سمجھتا تھا لہٰذا سیاسی مسائل میں کسی طرح کی دخل اندازی نہیں کرتا تھا۔ اسی بنا پر جب امام حسینؑ نماز کیلئے آمادہ ہوئے تو اپنے سپاہیوں کے ہمراہ جو امامؑ کے معتقد تھے۔ حضرت کی اقتدا میں نماز ادا کی۔ حر کو یہ حکم دیا گیا تھا کہ وہ امامؑ کو کوفہ لے جائے اور خاص طور سے انہیں واپس جانے کی مہلت نہ دے۔

امامؑ نے نماز کے بعد لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ :

"میں اس طرف آنے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ لیکن تمہارے خطوط اور تمہارا پیغام لانے والوں نے مجھے اس پر مجبور کیا۔ اب اگر تم مجھ سے عہد کرو کہ کسی طرح کا تعرض نہ کرو گے تو تمہارے شہر میں داخل ہوں، ورنہ دوسری صورت میں میں جہاں سے آیا ہوں وہیں واپس چلا جاؤں"۔

(دینوری ص ۲۴۹، بلاذری ج ۲، ص ۱۷۰، اعثم ج ۵، ص ۱۳۵)

حر نے کہا: مجھے خطوط کی کوئی اطلاع نہیں ہے جب اس کے سامنے خطوں کا انبار لگا دیا گیا تو بھی اس نے یہی کہا کہ مجھے حکم ملا ہے کہ آپؑ کو کوفہ لے جاؤں۔ امامؑ کوفہ جانے پر آمادہ نہ ہوئے اور حجاز کی جانب واپسی کا ارادہ فرمایا۔

(دینوری ص ۲۵۰)

لیکن حر کی فوج نے آپؑ کا راستہ روک لیا بہر حال یہ طے کر کے ''العذیب'' کے علاقہ کی طرف روانہ ہوئے۔

(دینوری، ص ۲۵۰، ابن اعثم ج ۵ ص ۱۴۱-۱۳۹، بلاذری ج ۲ ص ۱۷۰)

اسی موقع پر طرماح بن عدی نے امامؑ سے درخواست کی کہ آپ ''جبال طی'' کی طرف روانہ ہوں۔ لیکن ایک تو حر کی فوج سایہ کی طرح لگی ہوئی تھی دوسرے امام ''عذیب'' کی جانب سفر کا وعدہ کر چکے تھے لہٰذا طرماح کے مشورہ پر عمل نہ ہوا۔ (طبری، ج ۴ ص ۳۰۷، بلاذری، ج ۲ ص ۱۷۳، قبیلہ بنو طیٔ حاتم طائی کا قبیلہ ہے۔ حاتم کے لڑکے عدی رسولؐ خدا اور پھر حضرت علیؑ کے اصحاب میں سے تھے لہٰذا ان کے فرزند طرماں اپنی شیعت کی بنیاد پر یہ تجویز پیش کر رہے تھے)

دوران سفر امامؑ کی کوشش برابر یہ رہی کہ اپنا رخ ''بادیہ'' کے علاقہ کی طرف موڑ لیں۔ وہ چاہتے تھے کہ اپنے آپ کو کوفہ سے جس قدر دور کر سکیں کر لیں۔ لیکن حر آپؑ کی راہ میں حائل ہو جاتا تھا۔ یہاں تک کہ آپ ''قصر بنو مقاتل'' پہنچے اور وہاں سے نینوا۔ (دینوری، ص ۲۵۰، ۲۵۱)

یہیں ابن زیاد کا حکم پہنچا کہ قافلہ کو روک دیا جائے ''ولا تحلة الا بالعراء علي غير حضر و لاماء''۔ (بلاذری، ج ۲ ص ۱۷۶، دینوری ص ۲۵۱)

''انہیں بے آب و گیاہ اور خشک جگہ پر ٹھہرایا جائے''۔

یہیں شیعیان کوفہ میں سے چند افراد امامؑ کی خدمت میں پہنچنے میں کامیاب ہوئے۔ اور حر کی مخالفت کے باوجود امامؑ کی بارگاہ میں پہنچے۔

(بلاذری، ج ۲ ص ۱۷۲)

بلاذری نے لکھا ہے کہ امامؑ شام جانا چاہتے تھے اور آپؑ نے سپاہ حر سے تقاضا کیا تھا کہ انہیں شام جانے کی اجازت دیدے تا کہ وہاں جا کر یزید کی بیعت کر لیں۔

(بلاذری، ص ۳۰۷، کتاب کے تصحیح کنندہ نے حاشیہ میں اس روایت کی تکذیب کی ہے۔)

محققین نے اس روایت کو ضعیف قرار دیا ہے اور فطری سی بات ہے کہ امامؑ یہ آلام و مصائب اور سفر کی صعوبتیں اور جلاوطنی یزید کی بیعت نہ کرنے کی بنا پر ہی برداشت کر رہے تھے اور اگر روایت درست بھی ہوتی تو بھی امامؑ کے شام جانے کی خواہش کو کم از کم یزید کی خلافت کو قبول کرنے کے معنی نہ پہنانا چاہئے۔ بلکہ شام جانے کی خواہش کے سلسلہ میں احتمال قوی یہ ہے کہ آپ ابن زیاد کی حکومت کے علاقہ سے دور ہو جانا چاہتے تھے جو ایک جسور، فاسق و فاجر تھا۔

امام مطمئن تھے کہ بیعت نہ کرنے کی صورت میں یزید خود بھی انہیں قتل کر دے گا۔ چنانچہ یہ بات منطقی نہیں ہے کہ آپؑ عمداً شام جانے کا ارادہ رکھتے تھے۔ یزید نے خود ولید کو لکھا تھا کہ ولیکن جوابك الی رأس الحسین۔

(ابن اعثم ج ۵، ص ۲۶)

اگرچہ وہ خود اپنے ہاتھ سے یہ کام نہیں کرنا چاہتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے بعد میں امامؑ کے قتل پر ناراضگی اور رنج و غم کا اظہار کیا تھا۔

(طبقات ابن سعد، ترجمۃ الحسین، طبع در رسالہ تراثنا شمارہ ۱۰ ص ۱۹۲)

لہٰذا یہ بات قابل تسلیم نہیں کہ اگر امام نے یہ بات کہی بھی ہو گی تو آپؑ نے بیعت کا ارادہ کیا ہو گا یا سرے سے شام جانے کا قصد ہی فرمایا ہو گا۔

جس دوران حر کا لشکر امام کے ساتھ چل رہا تھا زہیر بن قین نے امامؑ سے درخواست کی کہ ان پر حملہ کر دیا جائے کیونکہ ابھی ان کی تعداد کم ہے۔ لیکن امامؑ نے اسے قبول نہیں کیا اور فرمایا: "انی اکرہ ان ابدئہم بالقتال"۔

(دینوری ص ۲۵۲)

"میں ان سے جنگ کی ابتداء کرنے میں کراہت محسوس کرتا ہوں"۔

زمین کربلا پر پہنچنے کی تاریخ دوسری محرم، چہار شنبہ یا پنجشنبہ کا دن تھا۔ دینوری نے چہار شنبہ کو اول محرم اور کربلا میں پہنچنے کا دن ذکر کیا ہے۔

(دینوری ص ۲۵۳)

دوسرے روز سے ابن زیاد کا لشکر رفتہ رفتہ کربلا میں جمع ہونے لگا۔ ابن زیاد بضد تھا کہ تمام اہل کوفہ اس جنگ میں شریک ہوں۔ لہٰذا تمام قبائل گروہ گروہ کربلا کی طرف روانہ ہوئے۔ اس سیاست نے فطری طور پر مستقبل میں کسی خاص قبیلہ پر الزام عائد ہونے سے بچالیا۔ بلکہ سب کا ہاتھ خون حسینؑ میں آلودہ کر دیا۔ اس طرح مستقبل کی بغاوتوں اور شورشوں کو روکنے میں کامیاب ہو سکتا تھا۔ ابن اعثم کی روایت کے مطابق ۲۲ ہزار افراد کوفہ سے روانہ کئے گئے۔ اگرچہ بلاذری، دینوری، اور طبقات ابن سعد سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بعض گروہ درمیان راہ سے ہی فرار کر گئے۔ (حر ایک ہزار نفر کے ہمراہ، حصین بن نمیر ۴ ہزار کے ہمراہ، شبث بن ربعی ایک ہزار نفر، شمر بن ذی الجوشن ۴ ہزار نفر، زید بن رکاب ۲ ہزار نفر، مصاب الماری ۳ ہزار نفر، نصر بن حربہ ۲ ہزار نفر، حجار بن ابجر ایک ہزار...... ابن اعثم ج ۵، ص ۱۵۹، بلاذری، ج ۲ ص ۱۷۹، دینوری ص ۲۵۴)

ابن زیاد نے اعلان کر دیا تھا کہ :ای مارجل وجدناه بعد یومنا هذا متخلفاً عن العسکر برئت منه الذمه"۔ (بلاذری، ج ۲ ص ۱۷۸)

"آج کے بعد جو بھی لشکر میں آنے سے انکار کرے گا میں اس سے بری الذمہ ہوں۔ (یعنی وہ قتل کر دیا جائے گا) اسی دھمکی کی وجہ سے اتنی بڑی جمعیت اور اتنا بڑا لشکر کربلا روانہ ہوا۔

عمر بن سعد وقاص جو دیلمی مشرکوں سے جنگ کرنے کیلئے عازم رے تھا یہ طے پایا کہ پہلے کربلا کے قضیہ کو تمام کرلے اس کے بعد رے کا ارادہ کرے۔ لہٰذا

لشکر کوفہ کے سردار کی حیثیت سے (اگرچہ ابتدا میں وہ خود اور بنو زہرہ نہیں چاہتے تھے کہ اس عمل میں دخیل ہوں) لیکن آخر کار اسے رے کی حکومت فرزند رسولؐ کا خون بہانے سے زیادہ اہم نظر آئی۔ لہٰذا عازم کربلا ہوا۔ (طبقات ابن سعد ' بحوالہ رسالہ تراثنا ص ۱۷۸ 'امام علیہ السلام نے بھی ایک نمائندہ ابن سعد کے پاس روانہ کیا تاکہ اسے اس عمل سے روکیں لیکن نمائندہ جو جواب لایا وہ یہ تھا: "وصی ابن سعد یقتلك بملك ری"۔ عمر سعد ملک ری کے بدلے میں آپؐ کے قتل پر آمادہ ہو گیا ہے۔ ابن اعثم ج ۵ ص ۱۷۳)

شروع میں ابن سعد نے امامؑ کی خدمت میں اپنا نمائندہ بھیجا اور ان سے یہاں تشریف آوری کا سبب دریافت کیا۔ امامؑ نے جواب میں وہ تمام خطوط دکھائے جو اہل کوفہ نے آپ کو بھیجے تھے فرمایا اگر تم لوگ میرے آنے پر راضی نہیں ہو تو مجھے چھوڑ دو' جہاں سے آیا ہوں وہیں واپس چلا جاؤں۔

عمر بن سعد جو خود اس جنجال سے چھٹکارہ کی تلاش میں تھا اس نے ابن زیاد کو خط لکھا کہ حسینؑ نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ مدینہ واپس چلے جائیں گے۔ یا ملک کے کسی گوشہ میں ایک عام اور معمولی فرد کی حیثیت سے زندگی گزار دیں گے۔ :
"ھذا لك رضا وللامة صلاح"۔ (ارشاد' شیخ مفید' ص ۲۳۹ طبع بصیرتی قم')

لیکن شمر درمیان میں حائل ہو گیا اور اس نے ابن زیاد کو جس میں نرمی کا رجحان پیدا ہو گیا تھا اس ارادہ سے منصرف کر دیا۔ اس نے کہا اگر حسینؑ یہاں سے چلے جائیں گے تو پھر ان پر ہاتھ نہیں ڈالا جا سکتا۔ لہٰذا ابن زیاد نے بھی عمر سعد کو ایک سخت خط لکھا کہ میں نے تمہیں اس لئے نہیں بھیجا ہے کہ حسینؑ کے ساتھ مدارا اور نرمی سے پیش آؤ' جس قدر جلد ہو سکے ان کے سامنے یزید کی بیعت کا سوال پیش کرو اور اگر وہ انکار کریں تو انہیں قتل کر دو۔ (فانظر فان نزل الحسینؑ

واصحابه علی الحکم فابعث بھم الی مسلما وان ابوافارخف الیھم حتی تقتلھم وتمثل بھم فانھم مستحقون لذالك"۔

(ابن اعثم ج ۵، ص ۶۶ البلاذری، ج ۲ ص ۱۸۳)

جب یہ پیغام امامؑ تک پہنچا تو آپؑ نے فرمایا: "لا اجیب ابن زیاد لاذالك ابداً فھل ھو الا الموت فمرحباً"۔ (دینوری ص ۲۵۴)

"میں ابن زیاد کو اس کا مثبت جواب نہیں دوں گا اور کیا اس کا نتیجہ سوائے موت کے اور کچھ ہے۔ پس کیا کہنا ایسی موت کا"۔

روز عاشور سے چند دن پہلے ابن زیاد کا سخت اور تاکیدی حکم پہنچا کہ پانی پر پہرہ لگا دیا جائے اور امام حسینؑ تک پانی پہنچنے کی راہیں بند کر دی جائیں۔ حل بین الحسینؑ والماء فلا یذوقوا قطرة کما صنع بالتقی الزکی عثمان"۔ (یہ حکم امامؑ کے کربلا پہنچنے کے تین روز کے بعد کا ہے۔ دیکھئے دینوری ص ۲۵۵، بلاذری، ج ۲ ص ۱۸۰۔ ابن زیاد نے جو عثمان کی مثال پیش کی ہے۔ یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ مخالفین کی طرف سے عثمان کے محاصرہ کے دوران حضرت علیؑ نے ہی ان کیلئے پانی بھجوایا تھا۔ دیکھئے تاریخ سیاسی اسلام تا سال ۴۰، ۷۳ ہجری)

"پانی اور حسینؑ کے درمیان اس قدر سخت پہرہ لگا دو کہ ایک قطرہ بھی ان تک نہ پہنچ پائے۔ ایسا ہی سلوک انہوں نے عثمان کے ساتھ کیا تھا"۔

اس نے ایک خط میں عمر سعد کو یہ بھی لکھا تھا کہ میں نے سنا ہے کہ حسینؑ اور ان کے اصحاب تک پانی پہنچ جاتا ہے۔ انہوں نے کنویں کھود لئے ہیں۔ جیسے ہی میرا خط تم تک پہنچے انہیں حتی الامکان کنویں کھودنے سے محروم کر دو اور پوری سختی رکھو کہ وہ کسی صورت میں فرات تک نہ پہنچنے پائیں۔ (ابن اعثم، ج ۵ ص ۱۶۲، طبری ج ۴، ص ۳۱۱، کنویں کی طرف اشارہ بعض لوگوں کے اعتراض کا

جواب ہو سکتا ہے۔ جو یہ کہتے ہیں کہ سرزمین کربلا پر ۲ یا ۳ میٹر گڑھا کھودنے پر پانی مل جاتا تھا اور فرات کی ضرورت نہیں تھی۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ ابن زیاد کا لشکر کس قدر شقی اور ظالم اور ان کا پہرہ کتنا سخت تھا)

آخری دنوں میں امام حسینؑ نے ابن سعد سے کئی خفیہ ملاقاتیں کیں تاکہ اسے اس عمل سے روک سکے۔ لیلن ابن سعد تاریخی روایات کے مطابق رے کی حکومت سے چشم پوشی نہ کر سکا۔

مادر جناب عباسؑ بن علیؑ سے شمر کا نسبی رشتہ ہونے کی وجہ سے شمر نے ابن زیاد سے ان کے اور ان کے بھائیوں کیلئے امان نامہ لے لیا تھا لیکن وہ حضرات امام حسینؑ کو تنہا چھوڑنے پر آمادہ نہ ہوئے۔

(بلاذری، ج ۲ ص ۱۸۴، ابن اعثم، ج ۵، ص ۱۶۸)

ایک دوسری جگہ جناب علی اکبرؑ کیلئے بھی امان نامہ کا ذکر ہوا ہے اور وہ بھی ماں کے رشتہ کی وجہ سے آیا تھا لیکن علی اکبرؑ نے اپنے پدر بزرگوار کی خدمت میں رہنے کو ترجیح دیا۔ (طبقات ابن سعد بحوالہ رسالہ تراثنا شمارہ ۱۰ ص ۱۸۲)

ابن زیاد کی فوج نو تاریخ کو عصر کے وقت ہی حملہ کا ارادہ رکھتی تھی لیکن امامؑ کے مطالبہ پر جنگ دوسرے دن تک کیلئے ٹال دی گئی۔

اس رات امامؑ نے اپنے اصحاب سے گفتگو کے دوران فرمایا کہ میں نے تم سب پر سے اپنی بیعت اٹھالی، تم لوگ جہاں جانا چاہو چلے جاؤ۔ حتی کہ میرے خاندان کے بعض افراد اپنے ہمراہ لے جاؤ۔ لیکن اصحاب امامؑ اپنی جگہ جمے رہے اور انہوں نے امامؑ سے اپنی وفاداری کا اعلان کیا۔ (طبقات ابن سعد بحوالہ تراثنا شمارہ ۱۰ ص ۱۷۸، الکامل ابن اثیر ج ۴، ص ۵۸۔۵۹)

شب عاشور امامؑ نے حکم دیا کہ خیموں کے اطراف میں ایک طرف کو چھوڑ کر

ہر طرف خندق کھودی جائے تاکہ دشمن ہر طرف سے ان پر حملہ نہ کر سکے۔ صبح عاشور دونوں فوجیں ایک دوسرے کے سامنے صف آرا ہوئیں۔ کسی طرح کا خوف وہراس اور ناتوانی وسستی امامؑ کی چھوٹی سی فوج میں دکھائی نہیں دیتی تھی۔

ابن سعد نے طبقات میں لکھا ہے کہ امامؑ کے ہمراہ ۵۰ مرد تھے اور ۲۰ افراد ابن زیاد کی فوج سے نکل کر آپؑ سے جا ملے تھے۔ جنگ سے پہلے امام حسینؑ نے دشمن کی فوج کے سامنے ایک تقریر فرمائی:

(طبقات ابن سعد ’تراثنا‘ ش ۱۰، ص ۱۶۸)

”میرے آنے کا سبب تمہیں لوگ تھے۔ تم نے لکھا تھا کہ سنت رسولؐ مٹائی جا رہی ہے۔ نفاق ہر طرف پھیل رہا ہے۔ تم لوگوں نے مجھ سے درخواست کی تھی کہ اپنے جد کی امت کی اصلاح کیلئے آؤں۔ اب اگر تم کو میرا آنا پسند نہیں ہے تو مجھے مہلت دو کہ میں یہیں سے واپس چلا جاؤں۔ تم لوگ خود اپنی جگہ پر غور کرو کہ کیا فرزند رسولؐ خدا کا خون بہانا جائز ہے۔ کیا رسولؐ کے چچازاد بھائی اور پیغمبرؐ پر سب سے پہلے ایمان لانے والے کے بیٹے اور حمزہؓ وعباسؓ و جعفرؓ کے بھتیجے کا قتل تمہاری نگاہ میں درست ہے؟ کیا تم نے پیغمبرؐ سے میرے بھائی کے بارے میں نہیں سنا کہ انہوں نے فرمایا: سیدا شباب اہل الجنہ۔ اگر تم میری بات نہیں مانتے تو جابر بن عبداللہ انصاری، ابو سعید خدری، او زید بن ارقم سے پوچھ لو“۔ (طبقات ابن سعد، بحوالہ رسالہ تراثنا، ش ۱۰ ص ۱۸۱، ابن اثیر، الکامل ج ۴ ص ۶۰۔۶۱)

بریر بن حفیر نے بھی اسی طرح کے استدلال اور اس سے ملتی جلتی باتیں کیں۔ (ابن اعثم، ج ۵ ص ۱۸۲)

یہاں تک کہ زہیر بن قین نے بھی جو ایک مشہور شخصیت تھے لوگوں کے سامنے اتمام حجت کیا۔ (کامل ابن اثیر' ج ۴ ص ۶۳)

حر بن یزید ریاحی جواب تک یہ سوچ رہا تھا کہ بات جنگ تک نہ پہنچے گی اور وہ بھی فرزند رسولؐ کے قتل کی نوبت تو بہر حال نہیں آئے گی لیکن جب اس نے صورت حال کو سنگین دیکھا تو عمر سعد کے پاس گیا اور کہا: کیا ان میں سے ایک بھی بات تمہیں قانع اور مطمئن نہیں کرتی۔ عمر سعد نے جواب دیا' اگر میرے ہاتھ میں ہوتا تو انہیں ہر گز قتل نہ کرتا!! لیکن اب کوئی چارہ نہیں ہے۔ حر بھی فوراً لشکر کو چھوڑ کر امامؑ کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ اور سب سے پہلا شہید قرار پایا۔

(کامل ابن اثیر ج ۴ ص ۶۴۔ ۶۵)

یزید بن ابی زیاد بھی ان لوگوں میں سے تھے جو اس وقت (یعنی جنگ سے پہلے) امامؑ کی خدمت میں حاضر ہو کر آپؑ کے قدموں پر شہید ہوئے۔

(کامل ابن اثیر' ج ۴ ص ۷۳)

حضرت علیؑ کی سیرت یہ تھی کہ خود جنگ کا آغاز نہیں فرماتے تھے۔ حضرت امام حسینؑ نے بھی کربلا میں جنگ کا آغاز نہیں کیا۔ بلکہ یہ عمر بن سعد تھا جس نے پہلا تیر اپنی کمان میں جوڑ کر لشکر امام کی طرف رہا کیا اور اہل لشکر کو آواز دی کہ تم سب گواہ رہنا کہ پہلا تیر میں نے لشکر حسینؑ کی طرف چلایا ہے۔

(طبری' ج ۴ ص ۳۲۶' ابن اعثم' ج ۵ ص ۱۸۳)

اس جنگ کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ ابتداً میں امامؑ کے جاں نثار ایک ایک کر کے لڑنے جاتے تھے۔ تھوڑی ہی دیر کے اندر دشمن کے کشتوں کی تعداد مومنین کے شہدا سے کہیں زیادہ ہو گئی تو عمرو بن حجاج نے یہ اشارہ کرتے ہوئے کہ تم لوگ عرب کے عظیم بہادروں سے جنگ کر رہے ہو یہ کہا: "لو لم ترموھم

بحجارة لقتلتمو کم"۔ (طبری ج ۴ ص ۳۳۱ کامل ابن اثیر ج ۴ ص ۶۷)

اگر تم ان پر پتھروں اور تیروں کی بارش نہ کرو گے تو وہ تم سب کو قتل کرڈالیں گے۔ جنگ کئی مرحلوں میں جاری رہی۔ پہلے امامؑ کے اصحاب اور اس کے بعد یکے بعد دیگرے امامؑ کے خاندان کے افراد درجۂ شہادت پر فائز ہوئے۔ ابن سعد نے طبقات میں اور دوسرے مورخین نے بھی ان معرکوں کے جزئیات قلم بند کئے ہیں۔ (مجلّہ توحید شمارہ ۵ ص ۱۲۷)

چند مسائل کی تحقیق

حادثۂ کربلا میں دینی گمراہی کا کردار :

جس زمانہ میں کربلا کا واقعہ وجود میں آیا' اسلامی معاشرہ کے حالات پیغمبرؐ اسلام کی حیات طیبہ کے آخری دنوں کے بہ نسبت بہت بدل چکے تھے۔ یہ صحیح ہے کہ یہ انحراف و گمراہی "تدریجی" تھی اور رفتہ رفتہ سامنے آئی تھی لیکن بہت سی نگاہوں میں اس کی بنیادیں پیغمبر اسلام کی رحلت کے ابتدائی برسوں میں ڈالی جاچکی تھیں۔ منجملہ یہ انحرافات ان بنیادی مسائل میں سے تھے جن سے "اہل سیاست" آسانی اور اطمینان کے ساتھ فائدہ اٹھاتے ہوئے لوگوں کو بیوقوف بنائیں اور اپنے ظلم واستبداد کی توجیہ کیلئے ان کا سہارا لے سکیں۔

بنو امیہ نے انحرافات و گمراہیوں کو وجود میں لانے اور انھیں پھیلانے میں بہت اہم کردار ادا کیا۔ خاص طور سے یزید کے تخت خلافت و حکومت پر بیٹھنے نے پورے طور سے یہ بات ظاہر کردی کہ بنو امیہ اسلام کی کسی حقیقت کے قائل نہیں ہیں۔ ان کے اعتقادات ہر طرح کی توجیہ کیلئے ایک پردہ اور لوگوں کے ذریعہ حکومت تک پہنچنے کا ایک وسیلہ ہیں۔

امام حسین علیہ السلام بنو امیہ کی طرف ''ظلم و عداوت'' کی نسبت ہی نہیں دیتے تھے۔ بلحہ انہیں ایسے لوگوں کا گروہ سمجھتے تھے جنہوں نے شیطان کی اطاعت قبول کی ہے اور اللہ کی اطاعت کو ترک کر دیا ہے۔

فسق و فساد کو بر ملا کر دیا ہے۔ حدود الہیہ کا کوئی پاس و لحاظ نہیں کرتا اور بیت المال پر زبر دستی قبضہ کئے ہوئے ہے [۱]۔

انہوں نے امت میں فسق و فساد برپا کیا' حدود الٰہی کو بدل ڈالا۔ دین کے بہت سے مفاہیم و مطالب میں تحریف کر دی گئی یا انھیں غیر شرعی مواقع پر استعمال کیا گیا۔ یہاں ہم ان مفاہیم کے چند نمونے تاریخی مثالوں کے ساتھ بیان کرتے ہیں جو واقعۂ کربلا کو جنم دینے میں موثر ثابت ہوئے ہیں۔

ائمہ کی اطاعت۔ تحفظ جماعت کی ضرورت۔ بیعت توڑنے کی حرمت

یہ تین ایسی رائج ترین اور عام مشہور اصطلاحیں ہیں جن سے متعدد خلفاء نے بھر پور فائدہ اٹھایا ہے۔ اور شاید یہ کہنا بھی بیجانہ ہوگا کہ ان نعروں نے نہ صرف ان کی خلافت کی بنیادوں کو استحکام بخشا ہے بلحہ انھیں دوام بھی عطا کیا ہے۔ یہ تینوں جملے صحیح ہیں اور اسلام کے دینی و سیاسی مفاہیم کا اہم جزو ہیں اور از نظر عقل بھی معاشرہ کے دوام اور اجتماعی نظام کو انحطاط و تنزل سے محفوظ رکھنے کیلئے ان کی رعایت بے حد ضروری ہے۔

ظاہر ہے کہ معاشرہ کے امام و رہبر کی اطاعت کس قدر اہمیت رکھتی ہے۔ امام کی اطاعت کا مطلب ہے نظام حاکم کی پیروی۔ لیکن یہ اطاعت امام عادل کی

---

[۱]۔ ابن اعثم' ج ۵ ص ۱۳۷' بلاذری ج ۲ ص ۱۷۱' ابن اعثم ج ۵ ص ۱۴۴۔ ۱۴۵' طبری ج ۴ ص ۳۰۴' یہ مفہوم دوسری عبارتوں میں بھی ذکر ہوا ہے کہ امام نے فرمایا: ''الا ترون ان الحق لا یعمل به وان الباطل لا یتناهی عنه'' طبری ج ۴ ص ۳۰۵' ابن عساکر تاریخ دمشق' ترجمۃ الحسین ص ۲۱۴ طبع بیروت۔ یوں ہی امام نے ایک اور جگہ فرمایا: '' فان السنة قداميتت وان البدعة قداحييت' طبری ج ۴ ص ۲۶ اور ابن اعثم ج ۵ ص ۱۴۴)

ہونی چاہئے یا عادل اور ظالم و جائر دونوں کی ؟ افسوس یہ ہے کہ تاریخ اسلام میں نہ فقط عملی طور سے دوسرا پہلو سامنے آیا بلکہ تھیوری اور فکری بنیاد کے طور پر بھی مسلمانوں کے ایک بڑے فرقے نے اسی دوسرے پہلو کو قبول کیا ہے۔

"تحفظ جماعت" یعنی شورش و فساد نہ ہونے دینا۔ ایسے اقدامات نہ کرنا جو "اتحاد" کو ٹکڑے ٹکڑے اور اسلامی معاشرہ میں تزلزل پیدا کر دیں۔ لیکن کیا ایک ظالم و جابر سلطنت اور فاسق و فاجر حکمراں کے مقابل "سکوت" اختیار کرنا درست اور مناسب ہے ؟ اور اس ظلم و استبداد کے خلاف جو آواز بھی اٹھے اسے "جماعت" کیلئے خلل انداز اور "تفرقہ" کا سبب کہا جا سکتا ہے ؟

بیعت توڑنے کی حرمت۔ اس عنوان کے تحت اسلام میں ایفائے عہد کی بڑی مدح کی گئی ہے اور عہد بیعت توڑنے کی شدید مذمت بھی کی گئی ہے۔ اور یہ واضح ہے کہ سیاسی مسائل میں بیعت کو کس قدر اہمیت حاصل ہے۔ لیکن اگر یزید جیسے خلیفہ کی بیعت نہ کی گئی تو کیا یہ بھی نقض بیعت ہوئی اور کیا اس سے جماعت کا اتحاد درہم و برہم ہوتا ہے ؟ کیا ہمیں اس مسئلہ کا اسی سادگی سے تجزیہ کرنا چاہئے ؟ یا ان مواقع کو استثنائی طور پر اس صف سے الگ کر دینا چاہئے ؟

جیسا کہ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں' خلفائے بنو امیہ اور اس کے بعد خلفائے بنو عباس نے ان ہی تحریف شدہ بے قید و شرط مفاہیم سے خوب فائدہ اٹھایا اور لوگوں کو دین کے نام پر اپنی حکومت قبول کرنے پر مجبور کیا۔

☆۔ جب معاویہ اپنے بیٹے یزید کیلئے لوگوں سے بیعت لے رہا تھا' تو وہ مدینہ میں بھی گیا تا کہ مخالفین کو بھی یزید کی بیعت کرنے پر مجبور کرے۔ جناب عائشہؓ بھی اس کے مخالفوں میں سے تھیں کیونکہ ان کے بھائی محمد ابن ابی بکر معاویہ کے ہاتھوں ہی شہید ہوئے تھے۔ جب بیعت کی بات سامنے آئی تو معاویہ نے

عائشہؓ سے کہا: میں نے یزید کیلئے تمام مسلمانوں سے بیعت لی ہے اب آپ کیا کہتی ہیں۔ کیا میں اس بیعت کو جو ثابت اور مستحکم ہو چکی ہے توڑ کر "ان یخلع الناس عهد هم" لوگوں کی بیعت اور تعہد کو کالعدم فرض کر لوں؟ جناب عائشہؓ نے جواب دیا: "انی لا اری ذالك ولكن عليك بالرفق و التأنی" میں ایسے عمل نقض بیعت کو جائز اور درست نہیں سمجھتی لیکن تم بھی لوگوں کے ساتھ نرمی اور ملائمت سے پیش آؤ۔

(ابن اعثم ج ۴ ص ۲۲۷' ابن قتیبہ ج ا'ص ۱۸۳)

اس مثال سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس مفہوم کے پرتو میں کس طرح حضرت عائشہؓ کو راضی کیا گیا۔

☆۔ ابواسحاق کہتا ہے کہ ہم (مسجد الحرام میں) نماز پڑھ رہے تھے۔ شمر ذی الجوشن بھی ہمارے ساتھ نماز پڑھ رہا تھا۔ نماز کے بعد اس نے اپنے ہاتھوں کو آسمان کی طرف بلند کر کے کہا: خدایا تو خوب جانتا ہے کہ میں شریف آدمی ہوں مجھے دامن عفوو بخشش میں جگہ عطا کر۔ میں نے اس سے کہا خداوند عالم تجھے کیسے بخشے گا جبکہ تو نے فرزند پیغمبرؐ کو قتل کیا ہے؟ شمر نے کہا: ہم کیا کرتے، ہم کو ہمارے حاکموں نے حکم دیا تھا کہ ایسا کریں۔ ہمیں بھی ان کی مخالفت نہیں کرنی چاہئے تھی کیونکہ اگر ہم ان کی مخالفت کرتے تو "کنا شرامن هذه الحم الشقا"۔ (طبقات ابن سعد 'بحوالہ تراشا'ش ۱۰ ص ۱۹۷' ابن حجر 'لسان المیزان ج ۳'ص ۱۵۲۔ ۱۵۳ (الحمیر السقائت))

☆۔ جناب مسلم بن عقیلؑ کے گرفتار ہونے کے بعد ابن زیاد نے ان سے کہا:

"یاشاق خرجت علی امامك و شققت عصا المسلمين"۔

"اے ...... تو نے اپنے امام کے خلاف خروج کیا اور اتحاد مسلمین میں رخنہ

اندازی کی ہے۔(ابن اعثم، ج ۵، ص ۹۸)

مسلم گمراہ کن باتوں کے آگے جھکنے والے نہ تھے، لہٰذا انہوں نے فرمایا:

"معاویہ نے اپنی خلافت اجماع امت کے ذریعہ حاصل نہیں کی بلکہ اس نے جانشین پیغمبرؐ کے خلاف حیلہ گری کے ذریعہ غلبہ حاصل کیا اور خلافت کو غصب کر لیا۔

☆۔ جب امام حسینؑ مکہ سے کوفہ کی طرف روانہ ہو رہے تھے تو عمرو بن سعید بن العاص حاکم مکہ کے نمایندے آپ سے کہنے لگے:

"الا تتقی الله تخرج عن الجماعة و تفرق بین هٰذه الامة"۔

"کیا تمہیں خوف خدا نہیں ہے جو جماعت مسلمین سے الگ ہو رہے ہو اور امت میں تفرقہ پیدا کر رہے ہو"۔(طبری، ج ۴، ص ۲۸۹۔ یہی غلط پروپیگنڈے تھے کہ جن کی بنا پر بہت سے لوگ خاص کر اہل شام امام حسینؑ کو امام وقت پر خروج کرنے والا اور کافر سمجھتے تھے)۔

☆۔ ابن زیاد کے کارندوں میں سے ایک شخص عمرو بن حجاج فخر کے ساتھ کہتا تھا کہ: ہم نے امام وقت کی اطاعت سے منہ نہیں موڑا اور جماعت واتحاد مسلمین سے کنارہ کشی اختیار نہیں کی۔ وہ ابن زیاد کے لشکریوں کو بھی یہ نصیحت کرتا تھا کہ:"الزموا طاعتکم و جماعتکم ولا ترتابوا فی قتل من مرق من الدین و خالف الامام"۔"امام وقت سے اپنی اطاعت اور جماعت کے تحفظ کو لازم جانو اور اس شخص کے قتل میں کوئی تردد و دریغ نہ کرو جو دین سے خارج ہو گیا اور امام کا مخالف ہو گیا ہے"۔(طبری، ج ۴، ص ۲۷۵۔ طبری، ج ۴ ص ۳۲۱)

☆۔ عبداللہ بن عمر جو اہل سنت کے فقہاء و محدثین میں سے ہیں۔ ان جیسے افراد

بھی یہ فکر رکھتے تھے کہ اگر لوگوں نے یزید کی بھی بیعت کرلی تو وہ بھی اس کی بیعت قبول کرلیں گے۔ اسی بنا پر انہوں نے معاویہ سے وعدہ کیا تھا کہ :

"فاذا اجتمع الناس علی ابنك یزید لم اخالف"ے ا۔ "اگر لوگوں نے تیرے بیٹے یزید کی بیعت کرلی تو میں اس کی مخالفت نہ کروں گا"۔

عمرۃ بنت عبدالرحمٰن بن عوف نے بھی امام حسینؑ کو لکھا کہ حاکم وقت کی اطاعت کا پاس و لحاظ رکھئے، جماعت کا تحفظ اور اتحاد اپنے اوپر لازم جانئے۔ (طبقات ابن سعد، تراثنا، ش ١٠، ص ١٦٧)

جبر کا عقیدہ

وہ عقیدہ جس کا تاریخ اسلام اور خاص طور سے واقعۂ کربلا پر بہت گہرا اثر پڑا، عقیدۂ جبر ہے۔ اس عقیدہ سے، اس سے پہلے بھی استفادہ کیا جاتا رہا ہے، لیکن صدر اسلام میں معاویہ اس کا مجدد تھا اور ابو ہلال عسکری کے بقول معاویہ اس عقیدہ کا موجد تھا۔ (ابی ہلال عسکری ج ٢، ص ١٢٥)

معاویہ یزید کی بیعت کے سلسلہ میں کہتا تھا :

"وان امر یزید قضاء من القضاء ولیس للقضاء الخیرۃ من امرھم"۔

"دراصل یزید کی حکومت کا مسئلہ قضاو قدر الٰہی میں سے ہے اور قضا کے سلسلہ میں کسی کو کوئی اختیار نہیں"۔ (ابن قتیبہ، ج ١، ص ١٨٣، ١٨٧)

☆۔ عبیداللہ بن زیاد نے حضرت امام سجادؑ سے فرمایا : "اولم یقتل اللہ علیاً"۔ کیا خدا نے علی اکبر کو قتل نہیں کیا"۔ امام سجادؑ نے فرمایا : "کان لی اخ یقال له

ے ا۔ (طبقات ابن سعد، بحوالہ تراثنا، ش ١٠، ص ١٦٧، معاویہ کے بقول ابن عمر بزدل شخص تھے (ابن اعثم ج ٤) انہوں نے امام حسینؑ سے بھی کہا کہ آپ قیام نہ فرمائیں، صبر و سکون سے رہیں اور اس صلح کو قبول کرلیں جسے تمام لوگوں نے تسلیم کرلیا ہے دیکھئے ابن اعثم ج ٥، ص ٣٩، طبقات ابن سعد بحوالہ تراثنا، ش ١٠، ص ١٦٦)

علی ' اکبر منی قتله الناس " ۔ "میرا ایک بھائی تھا جسے علی پکارتے تھے اور جس کو لوگوں نے قتل کر ڈالا"۔ (طبقات ابن سعد 'ترا شناش ۱۰' ص ۱۸۸)

☆۔ جب عمر سعد پر یہ اعتراض کیا گیا کہ تو نے حکومت رے کے عوض امام حسینؑ کو کیوں قتل کر ڈالا تو اس نے کہا: یہ عمل خدا کی جانب سے مقدر تھا اور طے پا چکا تھا۔ (ابن سعد طبقات الکبری' ج ۵' ص ۱۴۸ طبع بیروت)

کعب الاحبار بھی جب تک زندہ رہا یہ غیب گوئی کرتا رہا کہ حکومت بنو ہاشم تک نہیں پہنچے گی اگر چہ بعد میں بنو عباس بر سر حکومت آئے اور علویوں و فاطمیوں کو بھی حکومت ملی۔ یہی مطلب و مفہوم عبداللہ بن عمر کے ذریعہ بھی نقل کیا گیا ہے۔ اس نے کہا تھا کہ :"فاذا رأیت الهاشمی قد ملك الزمان فقد هلك الزمان"۔ "جب تم دیکھو کہ ہاشمی برسر اقتدار آگئے ہیں تو سمجھ لو کہ قیامت آگئی"۔ (ابن عساکر' تاریخ دمشق 'ترجمۃ الامام الحسینؑ تصحیح محمودی' ص ۱۹۳ طبع بیروت)

ان انحرافات اور گمراہیوں کا نتیجہ آئندہ بھی یہ ہوا کہ اہل سنت کی ایک بڑی جماعت نے امام حسینؑ کے اقدام کو کبھی بھی ظلم و فساد کے خلاف قیام نہ سمجھا بلکہ ان کے عمل کو صرف ایک غیر قانونی شورش سمجھتی رہی۔ (تاریخ اسلام دانشگاہ کیمبرج 'ج ۱' ص ۸۱ (متن انگریزی) دیکھئے الشبراوی کی الاتحاف بحب الاشراف ترجمۃ الحسین)

واقعۂ کربلا کے سلسلہ میں اہل کوفہ کا موقف

عام طور پر مشہور ضرب المثل کی طرح تاریخ کے آئینہ میں بھی کوفہ کے لوگ "اہل فساد و اہل خیانت" رہے ہیں۔ عہد وفا کا پاس ان کے یہاں ایک نادر' سی بات ہے۔ اہل کوفہ عجول اور جلد باز رہے ہیں۔ یہی ' عجلت ' فیصلہ میں جلد بازی ہمیشہ ان

کیلئے اور ان کے حکام کیلئے ضرر و نقصان کا باعث رہی ہے۔ جلدی سے رنجیدہ خاطر ہو جانا، جلدی سے قانع ہو جانا، جلدی سے تسلیم ہو جانا اور تیزی کے ساتھ سرکشی پر اتر آنا اہل کوفہ ان ہی ملے جلے کیفیات کے لوگ ہیں۔ یہاں ہم واقعۂ کربلا کے سلسلہ میں ان کے کردار، ان کی روش سے متعلق چند باتیں ہدیہ قارئین کرتے ہیں :

اہل کوفہ مختلف قبائل کا مجموعہ تھے اور مختلف حکام کے عہد میں ان قبائل کی مختلف ترکیب و تقسیم عمل میں آتی رہی۔ قبائل کی تقسیم بندی میں یہ تغیرات ہر عہد کے حکام کی نظر میں مناسب مصالح کی بنا پر ہوتے تھے اس کے باوجود زیادہ تر حکام قبائل کے سرداروں اور اشراف کے سلسلہ میں خاص رعایتوں سے کام لیتے تھے کیونکہ وہ جانتے تھے بہت سے مواقع پر ان کی قوت و طاقت حاکمان شہر سے بھی کہیں بڑھ کر ہے۔

اس شہر میں ایک مختصر سی تعداد شیعوں کی بھی تھی۔ یہ درست ہے کہ بعض قبائل، شیعہ مشہور تھے، لیکن کسی قبیلہ کو صد فی صد شیعہ نہیں کہا جا سکتا۔ شیعہ مختلف قبائل میں پراگندہ تھے لہٰذا ان میں قومی اتحاد نہیں پایا جاتا تھا۔ مزید یہ کہ قبائلی مزاج کے ساتھ ساتھ کوفہ کا مخصوص "مزاج" بھی ان میں بھرپور موجود تھا لہٰذا اس حیثیت سے وہ دوسروں سے الگ نہیں تھے۔

اس زمانہ میں شیعوں کی تعداد کچھ زیادہ نہ تھی۔ کہتے ہیں کہ جب "حجر بن عدی" نے مسجد کوفہ میں ابن زیاد کی تقریر کے خلاف کچھ کہنا چاہا تو مسجد میں موجود آدھے یا ایک تہائی افراد نے ان کی حمایت کی۔ اس کے باوجود مذکورہ بالا مزاج اور ایک قسم کے سیاسی تشیع کو دیکھتے ہوئے جو اس زمانہ میں کوفہ میں موجود تھا وہ لوگ صرف سیاسی مسائل کے تحت اولاد علیؑ سے جزوی لگاؤ رکھتے تھے۔ لہٰذا ایسے میں وہاں تشیع کو ایک قوت نہیں سمجھا جا سکتا تھا۔ (تاریخ اسلام، دانشگاہ کیمبرج، ج ۱، ص ۸۱ (متن انگریزی)

دیکھئے الشبراوی کی الاتحاف بحب الاشراف' ترجمۃ الحسینؑ)

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اہل کوفہ نے امام حسینؑ کو دعوت دیکر بلایا اور ان کی مدد و نصرت بھی نہیں کی بلکہ ان کے قتل میں براہ راست حصہ لیا' اس کے باوجود دیکھنا یہ ہے کہ یہ کون اور کس طرح کے لوگ تھے۔ ان میں سے کن لوگوں نے حضرت کو خط لکھے تھے اور کیوں براہ راست آپ کی مدد نہیں کی اور......

لیکن پہلے اس نکتہ کا ذکر کر دینا ضروری ہے کہ کوفہ نے بعد کے زمانہ میں تشیع کے سلسلہ میں کافی جدوجہد اور پیش رفت کی حتی کہ بنو عباس سے آل علیؑ کی حکومت غصب کرنے کی وجہ سے خاصی مخالفتوں کا اظہار کیا۔ اس بنا پر نہ صرف امویوں سے وابستہ مورخین و محدثین اہل کوفہ سے نفرت کرتے تھے بلکہ بنو عباس سے وابستہ افراد بھی ان سے یہی کینہ رکھتے تھے۔

شیعہ صرف سیاسی اعتبار سے مظلوم نہیں تھے بلکہ ثقافت و فرہنگ کے لحاظ سے بھی مظلوم تھے۔ بہر حال بنو عباس سے وابستہ ثقافتی و فرہنگی حاکمیت کے پیش نظر بھی یہ تنفر فطری اور بدیہی ہے۔ بنابر ایں واقعات کا جائزہ لینے کے سلسلہ میں اس عینک کو مد نظر رکھنا ضروری ہے جس میں اہل کوفہ اظہار تشیع کی بنا پر نفرت کا شکار نظر آتے ہیں۔

مذکورہ بالا نکتہ کو دیکھتے ہوئے یہ اشارہ بھی ضروری ہے کہ بعض مورخین نے اسی بنا پر شیعوں کو بے وفا اور بد عہد ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے کہ اس طرح وہ اہل کوفہ کی بے وفائی اور بد عہدی کو شیعوں کی گردن پر لاد دیں۔ جبکہ مندرجہ ذیل توضیحات کافی حد تک یہ ظاہر کر دیں گے کہ ان حالات میں کوفہ میں صرف تھوڑے افراد شیعہ تھے اور جو لوگ تھے وہ بھی اپنی مزاجی اور روحی کیفیات کے تحت امام حسینؑ کا دفاع نہ کر سکے۔ اگرچہ ان میں بھی ایثار و فداکاری کا بھرپور

جذبہ ہوتا تو ایسا ہرگز نہ ہونے دیتے۔ یہ ہے اس سلسلہ میں ہمارے نظریہ کا خلاصہ جس کے ثبوت میں ہم چند مثالیں پیش کر رہے ہیں۔

ان حالات کے تحت کوفہ کی جو تصویر پیش کی جاسکتی ہے وہ یہ ہے: یزید ایسا شخص تھا کہ اگرچہ اہل شام کیلئے اسے برداشت کرنا آسان تھا لیکن اہل عراق کیلئے اسے برداشت کرنا کسی قدر مشکل تھا۔ جب وہ تخت خلافت پر بیٹھا تو کوفہ کے شیعوں نے اس کی مخالفت شروع کر دی۔ بہت سے اہل کوفہ جن کی نظر میں یزید کے بدلے اس کی جگہ پر کوئی مناسب جانشین نہیں تھا۔ عمومی ماحول کے تحت انہوں نے بھی اس منصب کیلئے حسینؑ بن علیؑ کو منتخب کیا۔ اس سلسلہ میں جو شیعوں کی طرف سے حضرت حسینؑ کو دعوت کا آغاز ہوا تو صرف عوام نے ہی اپنے مخصوص مزاج کے تحت اپنی حمایت کا اظہار نہیں کیا بلکہ مختلف قبائل کے اشراف نے بھی اپنی حیثیت خطرہ میں دیکھتے ہوئے یا عام لوگوں کے زیر اثر آکر امام حسینؑ کی حمایت کا اظہار شروع کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ امام حسینؑ کی حمایت سے متعلق ایک مصنوعی فضا قائم ہو گئی۔ یہ فضا جو معاویہ کی موت کے بعد ایک سیاسی خلا پیدا ہو جانے کی وجہ سے قائم ہو گئی تھی۔ اور بنو امیہ بھی ایک مدت تک اس پر قابو نہیں پا سکے۔ اور خاص طور سے کوفہ میں نعمان ابن بشیر جیسے ضعیف حاکم کی موجودگی میں یہ فضا وسعت اختیار کرتی گئی اور جب تک ابن زیاد کوفہ نہیں آیا تھا اس میں تیزی سے وسعت پیدا ہوتی جارہی تھی[۱۰]۔

امامؑ کے ایک ارشاد کو دیکھتے ہوئے اشراف قبائل کی طرف سے حضرت کو دعوت دیئے جانے کے سلسلے میں ایک دوسرا احتمال بھی دیا جاسکتا ہے اور وہ یہ کہ

۱۰۔ عمر بن حجاج اور شبث بن ربعی جو کربلا میں ابن زیاد کی فوج کے سرداروں میں شمار ہوتے تھے، بھی ان لوگوں میں سے تھے جنہوں نے امام حسینؑ کو خط لکھ کر آنے کی دعوت دی کی تھی۔ دیکھئے ابن اعثم، ج ۵، ص ۵۰۔۵۱)

ان لوگوں نے عمداً یہ فضا قائم کی تھی تا کہ امام کو عراق آنے پر مجبور کریں اور وہاں انھیں شہید کر ڈالیں۔ امامؑ نے فرمایا تھا:

"وما كانت كتب الي الا مكيدة لي وتقرباً الى ابن معاوية"۔

"ان لوگوں نے یہ خطوط مجھے دھوکہ دینے اور یزید کے دربار میں تقرب حاصل کرنے کیلئے لکھے تھے"۔

(بلاذری ج ۲، ص ۱۸۵، ابن اعثم، ج ۵ ص ۱۶۹)

بہر حال یہ طے ہے کہ امام حسینؑ کی حمایت میں قائم کی جانے والی اس فضا کا ایک بڑا حصہ مثبت تھا اور جب حضرت مسلمؑ کوفہ تشریف لے گئے تو ان حالات سے انہوں نے بھی ایسا ہی نتیجہ اخذ کیا کہ امام حسینؑ کو فوراً کوفہ آنے کی دعوت دیدی۔

ابن زیاد کا اہل کوفہ پر دباؤ

ایسے لوگ کم ہوتے ہیں جو ایک ظالم و جابر ڈکٹیٹر کے ہوتے ہوئے مخالفت کی آواز بلند کرتے ہیں اور حاکم کی قوت و طاقت کے سامنے چیلنج بن کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔

جب نعمان بن بشیر کوفہ کا حاکم تھا تو لوگ اس کی سہولتوں کی بنا پر پورے اطمینان سے اظہار تشیع کرتے تھے۔ چنانچہ جب حضرت مسلمؑ کوفہ آئے تو لوگوں نے بڑے جوش و خروش کے ساتھ ان کی حمایت کی لیکن حاکم کی تبدیلی اور نعمان بن بشیر کی جگہ ابن زیاد کی آمد نے حالات کو ایکدم بدل کر رکھدیا۔ ابن زیاد کی خشونت نے اکثر و بیشتر کوفہ پر خوف و ہراس طاری کر دیا۔ اور وہ لوگ جو بہت زیادہ زود رنج اور جلد باز تھے انہوں نے صرف ابن زیاد کی طرف سے خود کو گھرا ہوا دیکھا بلکہ ابن زیاد کی جانب سے پھیلائی گئی افواہ کہ عنقریب شام سے فوج آنے والی ہے، کے زیر اثر پورے طور سے لوٹ گئے۔

یہ حالات اس وقت اور زیادہ گمبھیر ہو گئے جب اشراف کو بھی اطمینان ہو گیا کہ بنوامیہ کی حاکمیت مستحکم ہو چکی ہے اور وہ ابن زیاد سے آ ملے۔ فطری سی بات ہے کہ عام افراد اپنے قبائل کے سرداروں کی مخالفت اپنے حق میں کسی طرح بھی درست اور مصلحت آمیز نہیں سمجھتے تھے۔ جب مسلمؑ نے ابن زیاد کی قیام گاہ پر حملہ کیا تو ان ہی اشراف نے ڈرا دھمکا کر اور لالچ دیکر ان کے ساتھیوں کی تعداد کم سے کم تر حد تک پہنچا دیا اس طرح لوگوں پر تسلط کے سلسلہ میں اپنی قوت و طاقت کا اظہار بھی کیا۔ (طبری، ج ۴، ص ۲۷۷، ابن اعثم)

ابن زیاد کے ظلم و استبداد کے مقابلے میں اگر کسی قبیلہ کا سردار بھی مخالفت کا اظہار کرتا تھا تو قبیلہ کے بقیہ افراد میں اس کی حمایت کی جرأت نہیں ہوتی تھی۔ یہ تو قبائلی بنیاد پر حمایت کا حال تھا۔ ۔م حسینؑ کو مذہبی جماعت تو بہت دور کی بات جب ہانی بن عروہ کو گرفتار کیا گیا تو وہ قبیلہ بنو مراد کے سردار تھے اور مورخین کے مطابق وہ چار ہزار اسپ سوار اور آٹھ ہزار پیادہ جوانوں کے سردار تھے۔ یہی نہیں بلکہ کندہ کے رہنے والے قبیلہ بنو مراد کے حلیفوں کو ان میں شامل کر لیا جاتا تو یہ تعداد تیس ہزار تک پہنچتی۔ اس کے باوجود انہیں بازار کوفہ میں زمین پر گھسیٹا جا رہا تھا۔ وہ چیختے تھے لیکن کوئی ان کی فریاد کو نہیں پہنچتا تھا۔ اس کے بعد انہیں قتل کر دیا گیا اور کسی نے اس کے خلاف، زبان تک نہ کھولی۔

جب امام حسینؑ نے کربلا میں توقف فرمایا تو ابن زیاد نے اپنی ایک تقریر کے دوران اہل کوفہ سے کہا کہ سب کربلا کی طرف جائیں۔ اس نے دھمکی دیتے ہوئے کہا کہ :

"فایما رجل وجدناه بعد یومنا هذا متخلفاً عن العسکر برئت منه الذمة"۔

"آج کے بعد سے جو بھی فوج میں جانے سے انکار کرے گا میں اُس سے بری الذمہ ہوں"۔

(بلاذری، ج ۲، ص ۱۷۸، دینوری، اخبار الطوال ص ۲۵۴۔۲۵۵)

اس کا مطلب تھا کہ وہ قتل کر دیا جائے۔ اسی بنا پر ابن زیاد نے قعقاع بن سوید کو حکم دیا کہ شہر کوفہ میں گھوم پھر کر دیکھے کہ کسی نے فوج میں جانے سے مخالفت تو نہیں کی ہے۔ قعقاع نے اپنی نگرانی اور تلاش کے دوران قبیلہ حمد کے ایک شخص کو دیکھا جو اپنے باپ کی میراث لینے کیلئے کوفہ آیا ہوا تھا۔ وہ اسے پکڑ کر ابن زیاد کے پاس لے گیا۔ اس نے فوراً اس کے قتل کا حکم دیدیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ :" قل یبق محتلم بكوفه الاخرج الى العسكر بالنخلية"۔ (بلاذری ج ۲ ص ۱۷۹)

"کوفہ میں کوئی بالغ ایسا نہیں تھا جو لشکر گاہ کی جانب روانہ نہ ہوا ہو"۔

تلواریں حسینؑ کی طرف اٹھنے لگیں اور ان کے خلاف حرکت میں آنے لگیں جبکہ یہ بات اطمینان سے کہی جاسکتی ہے کہ اگر لوگوں کی اپنی مرضی کا سوال ہوتا تو وہ یہ اقدام ہرگز نہ کرتے۔ حتی ان میں ایک بڑا گروہ ایسے ہی لوگوں کا تھا۔ اسی روشنی میں ہم اہل کوفہ کی توصیف میں کہے گئے فرزدق کے قول کو بخوبی سمجھ سکتے ہیں کہ انہوں نے امامؑ سے کہا :"قلوبهم معك وسيوفهم عليك"۔ (طبری ج ۴ ص ۲۹۰، ابن اعثم ج ؟ ص ۱۰۰) دوسرا قول بھی ملتا ہے :"انت احب الناس الى الناس والقضاء فى السماء والسيوف مع بنى امية"۔

(طبقات ابن سعد بحوالہ تراثنا، ش ۱۰، ص ۱۷)

"اہل کوفہ کے دل آپ کی طرف مائل ہیں لیکن ان کی تلواریں آپ کے خلاف ہیں۔ آپؑ لوگوں کی نگاہ میں محبوب ترین شخص ہیں، قضا و قدر آسمان میں ہے اور تلواریں بنوامیہ کے ساتھ ہیں"۔

لوگ ان حالات میں خود کو کربلا جانے سے روک نہیں سکتے تھے کیونکہ کربلا نہ جانے کا مطلب قتل ہونا تھا۔ اب شیعوں کیلئے اور ان لوگوں کیلئے جو اس کارزار

میں شریک ہونا نہیں چاہتے تھے دو ہی راستے تھے۔یا وہ جا کر امام سے ملحق ہو جائیں اور یا اس علاقہ سے ہی دور ہو جائیں اور فرار کر جائیں۔

لشکر ابن زیاد سے لوگوں کا فرار اور امام کے لشکر میں شرکت

بعض بہت قدیم روایات سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ اہل کوفہ جو تلوار کی نوک پر امام حسینؑ سے جنگ کیلئے کربلا بھیجے گئے تھے راستہ ہی سے فرار کر گئے اور بہت سے لوگ کربلا نہیں پہنچے۔ کربلا میں ابن زیاد کی سپاہ کی جو تعداد بتائی جاتی ہے یہ وہ تعداد ہے جو لشکر کربلا روانہ کرتے وقت قلم بند کی گئی ہے۔ لیکن جیسا کہ آپ آگے ملاحظہ فرمائیں گے ان میں سے بہت سے افراد فرار کر گئے اس طرح فطری طور پر کوفی لشکر کی تعداد کربلا میں شاید تقریباً دس ہزار یا اس سے بھی کم رہی ہو اور یہ تعداد کوفہ کی آبادی کی بہ نسبت بہت کم ہے۔ کہا جاتا ہے کہ مسجد کوفہ میں چالیس ہزار افراد کی گنجائش تھی۔اس مقولہ کے مطابق معلوم ہوتا ہے کہ بہت سے لوگ یا کوفہ میں مخفی ہو گئے یا میان راہ سے فرار کر گئے ہیں۔(تشیع در مسیر تاریخ ص ۱۶۰'(متن انگریزی) مدرک' قدیم حوالوں سے نقل شدہ ہے)

بلاذری نے لکھا ہے کہ :

"وکان الرجل یبعث فی الف فلا یصل الا فی ثلاث مأة اواربع مأة لواقل من ذلک کراھة منھم لھٰذا لوجه"۔(بلاذری' ج ۲' ص ۱۷۹)

"ایک سپہ سالار ہزار نفری کی فوج کے ساتھ بھیجا جاتا تھا لیکن جب وہ کربلا پہنچتا تھا تو تین سو (۳۰۰) یا چار سو (۴۰۰) یا اس سے بھی کم افراد اس کے ساتھ ہوتے تھے اور یہ اس وجہ سے تھا کہ لوگ اس جنگ میں شریک ہونے میں کراہت محسوس کرتے تھے"۔

دینوری نے بھی لکھا ہے کہ :

"جب ابن زیاد کسی افسر کو جمع کثیر کے ساتھ کربلا روانہ کرتا تھا"۔

"یصلون الی کربلا ولم یبق منهم الا القلیل کانوا یکرهون قتال الحسینؑ فیر تدعون فیتخلفون"۔

"بہت کم افراد کربلا پہنچتے تھے اور اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ لوگ امام حسینؑ سے جنگ کو غلط سمجھتے تھے۔ لہٰذا فرار کرتے تھے اور فوج سے جدا ہو جاتے تھے"۔ (دینوری' اخبار الطّول ص ۲۵۴)

فرار کے علاوہ ایک گروہ امام حسینؑ کی حمایت میں آپ کے مختصر سے لشکر میں ملنے کیلئے کوشاں تھا۔ جب امام حسینؑ کربلا پہنچے تو روز شہادت یعنی عاشور کو آٹھ روز باقی تھے۔ بہت سے لوگوں کو یہ گمان بھی نہیں تھا کہ ایسا حادثہ پیش آجائے گا اور بات اس قدر آگے بڑھ جائے گی۔ حتی کہ حُر بن یزید ریاحی نے جب صبح عاشور صورت حال کو نازک دیکھا تو مصمم ارادہ کے ساتھ امامؑ کی طرف چلے آئے۔ معلوم ہوا کہ وہ شیعہ جو امامؑ کی حمایت اور نصرت کرنا چاہتے تھے انہوں نے عجلت سے کام نہیں لیا اور تنہا یہ چند افراد تھے جو ابتدا میں امامؑ سے ملحق ہونے میں کامیاب ہو پائے' مثلاً : نافع بن ہلال مرادی' عمر بن خالد صیداوی' سعد غلام عمر بن خالد' مجمع بن عبداللہ القائدی از قبیلہ مذحج۔ امام کے لشکر میں شامل ہونے میں کامیاب ہوئے۔ روز عاشور کے قریب مسلم بن عوسجہ اور حبیب ابن مظاہر امامؑ کی خدمت میں پہنچنے میں کامیاب ہوئے۔ ابن سعد نے بھی طبقات میں لکھا ہے کہ عاشور کی صبح کو بیس افراد امامؑ کے لشکر میں ملحق ہوئے۔ ابن قتیبہ نے ان کی تعداد تیس نقل کی ہے۔ (بلاذری' ج ۲' ص ۱۷۲۔ ابن سعد بحوالہ تراثنا' ش ۱۰' ص ۱۷۸' الامامۃ والسیاسۃ' ابن قتیبہ' ج ۲' ص ۷)

اپنی فوج سے فرار اور امامؑ کے لشکر میں شرکت نے ابن زیاد کو مجبور کیا کہ

لوگوں کو اس سے روکے۔ ابن سعد نے طبقات میں ایک بہت قدیم راوی سے نقل کیا ہے :"وجعل الرجل والرجلان والثلاثة یتسللون الی حسینؑ من الکوفه"۔ "لوگ ایک ایک ' دو دو یا تین تین افراد کی صورت میں امام حسینؑ کی سمت جا رہے تھے"۔ یہ خبر ابن زیاد کو پہنچی تو اس نے بھی لشکر گاہ کو تیار کیا اور عمرو بن حریث کو اس کا ذمہ دار بنایا کہ لوگوں کو نخیلہ (یعنی لشکر گاہ) کی طرف جانے پر مجبور کرے اور اس پل کو بھی نظر میں رکھے کہ کوئی وہاں سے گزر تو نہیں رہا ہے۔ (امام حسینؑ کی طرف تو نہیں جا رہا ہے ؟)۔

(ابن سعد 'تراشا' ش ۱۰ 'ص ۸ ۷ ۱ '۹ ۷ ۱)

یوں ہی اس نے حصین بن نمیر کو حکم دیا کہ وہ قادسیہ اور قطقطانہ کے درمیان کے علاقہ کو زیر نظر رکھے اور کسی کو اس طرف سے حجاز کی جانب جانے نہ دے (کیونکہ اس طرح وہ امام حسینؑ سے جا ملے گا) سوائے ان لوگوں کے جن کیلئے اطمینان ہو جائے کہ وہ حج کیلئے گئے تھے اور ان پر حسینؑ کی دوستی کا التزام نہیں ہے۔ (اخبار الطّوال 'دینوری ص ۲۴۳)

ادھر اس نے والی بصرہ کو لکھا کہ وہ دیدبانوں کو مقرر کرے کہ وہ تمام راستوں پر کنٹرول رکھیں اور اگر کوئی ادھر سے عبور کرے ' اسے فوراً گرفتار کریں۔ ظاہر ہے کہ اس سے مراد وہی افراد تھے جو مخفی طور پر ادھر سے امام حسینؑ کی نصرت کو آنے والے تھے۔ (؟ج ؟ص ۲۶۳)

اسی طرح اس نے حکم دیا کہ شام اور بصرہ کی شاہراہوں کے درمیان کے تمام راستے زیر نظر رکھے جائیں اور "ولا یدعون...... ولا یخرج" کوئی اس طرح سے حرکت نہ کرنے پائے اور نہ خارج ہونے پائے۔

(بلاذری 'ج ۲ 'ص ۳ ۷ ۱۔۹ ۷ ۱ 'طبری 'ج ۴ 'ص ۲۹۵)

ایک بار حبیب ابن مظاہر نے کربلا سے نزدیک رہنے والے قبیلہ بنو اسد کو امام حسینؑ کی نصرت پر آمادہ کیا لیکن عبید اللہ ابن زیاد کی فوج نے ان میں سے ستر افراد کو گھیر لیا اور امامؑ تک جانے نہیں دیا۔

(بلاذری ج ۲ ص ۱۸۰، ابن اعثم ج ۵ ص ۱۵۹۔۱۶۰)

گویا یہ شدید نگرانی اہل کوفہ کی طرف سے امام کی حمایت و نصرت نہ کئے جانے کا سب سے مؤثر سبب شمار ہو سکتی ہے۔ دھمکی کے علاوہ تطمیع اور لالچ کو بھی ایک حربہ کے طور پر استعمال کیا گیا۔ ابن زیاد نے لوگوں کے روانہ ہونے سے قبل ان سے کہا: یزید نے میرے پاس چار ہزار دینار اور دو لاکھ درہم بھیجے ہیں تاکہ میں اسے تمہارے درمیان تقسیم کردوں اور تمہیں دشمن سے جنگ کیلئے کوفہ سے باہر لے جاؤں۔ (ابن اعثم ج ۵ ص ۱۵۷)

مال کی کشش بھی ان میں سے اچھے خاصے افراد کو کربلا میں امام حسینؑ کے خلاف آمادہ کر سکتی تھی۔ جب امام حسینؑ نے دیکھا کہ لوگ واقعاً میرے قتل کا ارادہ رکھتے ہیں تو فرمایا: "یا ھٰؤلاء اسمعو یرحمکم اللہ مالنا و مالکم ماھٰذا بکم یا اھل الکوفہ؟ قالوا خصمنا العطاء" اے لوگو! سنو یہ ہمارے اور تمہارے درمیان کون سی چیز حائل ہو گئی ہے اور اے اہل کوفہ یہ تمہیں کیا ہو گیا؟ انہوں نے کہا کہ ہم "عطا" کے سلسلے میں خوف زدہ ہیں (کہ کہیں ہمارے ہاتھ سے نکل نہ جائے) آقاؑ نے جواب دیا: "تمہارے لئے خدا کے پاس بہترین عطا ہے"۔ لیکن کسی نے آپ کی باتوں پر توجہ نہ کی۔

یہ تمام ثبوت اور مثالیں اس نکتہ کی طرف توجہ دلاتی ہیں کہ درحقیقت اشراف اور ان سے وابستہ افراد ہی وہ ظالم تھے جو تمام دشنام اور ملامتوں کے مستحق ہیں۔ اہل کوفہ کے درمیان ایسے بہت سے لوگ بھی تھے جو اس ڈکٹیٹر اور استبدادی

حکومت کے باوجود امامؑ کی خدمت میں پہنچنا چاہتے تھے مگر پہنچ نہ سکے۔ ایک بہت ہی لطیف اور دلچسپ نکتہ بلاذری نے نقل کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے : سعد بن عبیدہ کا کہنا تھا کہ کوفہ کے بہت سے بوڑھے ایک پہاڑی پر کھڑے یہ کہتے تھے :"اللهم انزل عليه نصرك" خدایا اپنی نصرت حسینؑ پر نازل فرما۔ سعد کہتا ہے کہ میں نے ان سے کہا :"يااعداء الله اتنزلون فتنصر ونه"۔ اے دشمنان خدا نیچے کیوں نہیں اترتے تاکہ جاکر ان کی مدد کرو"۔ (بلاذری ج ۲ ص ۲۲۶، ابن عساکر تاریخ دمشق ترجمۃ الحسینؑ ص ۱۹۷ طبع بیروت تصحیح معموری، اخبار الطّوال)

امامؑ کے سفر عراق پر ایک نظر

واقعۂ کربلا کے غیبی پہلوؤں سے صرف نظر کرتے ہوئے ہم یہاں امام حسینؑ کے سفر عراق کا سیاسی نقطۂ نظر سے ایک جائزہ پیش کرتے ہیں۔ امام حسینؑ کیلئے عراق جانے کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ بھی موجود تھا یا نہیں ؟ کیا اس کے امکانات فراہم ہو چکے تھے کہ عراق میں یزید کے خلاف انقلاب برپا کیا جا سکتا ہے ؟

اگر ہم عام تاریخی کتابوں کا جائزہ لیں تو ہمیں ان اعتراضات کا ایک سلسلہ نظر آتا ہے جو بار بار سامنے آتے ہیں اور ان کا مضمون یہی ہے کہ عراق جانا کسی بھی صورت سے درست اور مصلحت آمیز نہیں ہے۔ یہ اعتراضات اس کے پہلے بھی ہوئے ہیں جب امام حسنؑ کی شہادت کے بعد اہل کوفہ نے امام حسینؑ کو کوفہ آنے کی دعوت دی تو امامؑ نے جواب دیا کہ جب تک معاویہ زندہ ہے وہ اس نظام کے خلاف کسی مسلحانہ تحریک کے حق میں نہیں ہیں۔ شاید اس کا سبب یہ تھا کہ اہل عراق معاویہ کی فریب کاری اور حیلہ گیری کی تاب نہیں لا سکتے تھے وہ ان کے پدر بزرگوار حضرت علیؑ اور بھائی امام حسنؑ کی زندگی میں معاویہ کے مقابلہ میں آزمائے جا چکے تھے۔ (دینوری ص ۲۲۴۔ ۲۲۳)

چونکہ بیعت سے امامؑ کی مخالفت اور مدینہ سے مکہ کی طرف روانگی کے ساتھ ساتھ عراق کی جانب سفر کا احتمال بھی تھا۔ لہٰذا بعض روایات کے مطابق عبداللہ بن مطیع نے مدینہ اور مکہ کے درمیان ہی حضرت کو کوفہ جانے سے منع کیا۔ (ابن اعثم ج ۵، ص ۳۶،۳۷۔ اخبار الطّوال دینوری ص ۲۲۸،۲۴۶)

جب امامؑ مکہ میں وارد ہوئے تو امامؑ کو روکنے اور منع کرنے والوں کی ایک بڑی تعداد وہاں موجود تھی۔ عبداللہ بن عباس نے حضرتؑ کو مشورہ دیا کہ عراق جانے کا ارادہ ترک کر دیں اور جبال یمن کی طرف چلے جائیں کیونکہ ایک تو وہ کوہستانی علاقہ ہے اور دوسرے اس علاقہ میں آپ کے پدر بزرگوار کے شیعہ بہت ہیں۔ لہٰذا وہ خطہ، امن وامان کے اعتبار سے بہت بہتر ہے۔ (اخبار الطّوال، دینوری ص ۲۲۴، ابن اعثم ج ۵، ص ۱۱۳، طبری ج ۴، ص ۲۸۷، بلاذری، ج ۲ ص ۱۶۱)

ابن اعثم نے یہی بات محمد بن حنفیہ سے نقل کی ہے۔

(ابن اعثم ج ۵، ص ۳۲)

عمرو بن عبدالرحمٰن بن ہشام نے بھی کہا تھا کہ لوگ دینار ودرہم کے بندے ہیں اور یہ حربہ حکام کے پاس موجود ہے لہٰذا عراق نہ جایئے۔ (بلاذری، ج ۲، ص ۱۶۱، ابن اعثم ج ۵، ص ۱۱۰۔۱۱۱، طبری ج ۴، ص ۲۸۷)

عبداللہ بن عمر بھی امامؑ کے اس ارادہ پر معترض تھے اور خونریزی سے خوفزدہ تھے۔ (بلاذری، ج ۲، ص ۱۶۳، ابن اعثم ج ۵، ص ۳۹۔ ابن سعد بحوالہ تراثنا، ش ۱۰، ص ۱۶۶)

عبداللہ بن جعفر نے بھی عراق میں آپؑ کے قتل کئے جانے کے امکان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا کہ اگر آپؑ قتل ہوگئے تو: "انی اخاف ان یطفی نورالارض وانت روح الھدیٰ وامیرالمومنین فلا تجعل الی العراق فانی

آخذلك الامان من يزيد"۔ (ابن اعثم ج ۵ ص ۱۱۶، طبری ج ۴ ص ۲۹۱)

"میں ڈرتا ہوں کہ آپ کے قتل سے کہیں زمین کا نور خاموش نہ ہو جائے۔ آپؑ ہدایت کی روح اور مومنین کے امیر ہیں۔ عراق جانے میں جلدی نہ کیجئے۔ میں یزید سے آپ کیلئے امان نامہ لے لوں گا"۔

ابو سعید خدری نے بھی غالباً کہا تھا کہ: "لا تخرج علیٰ امامك"۔

(ابن سعد، تراشاش ۱۰، ص ۱۶۵)

سور بن مخرمہ بھی امامؑ کو روکنے والوں میں سے تھے۔ انہوں نے امامؑ کو لکھا کہ: "اہل عراق کے دھوکہ میں نہ آیئے"۔

(طبقات ابن سعد بحوالہ تراشاش ۱۰، ص ۱۶۷)

ابو واقد جبشی نے بھی اسی طرح کی بات امامؑ سے کہی تھی۔

(طبقات ابن سعد بحوالہ تراشا، ش ۱۰، ص ۱۶۶)

فرزدق بھی جو عراق سے حجاز جارہے تھے امامؑ کو اس سفر سے روکنے والوں میں سے ایک تھے۔ (طبقات ابن سعد بحوالہ تراشا، ش ۱۰، ص ۱۶۵)

تاریخ کی کتابوں نے اسی طرح کی بہت سے مخالفتوں کا ذکر کیا ہے۔ اور احتمالاً بہت سے مخالف راویوں نے ان روایات کو جابجا شائع اور مشہور بھی کیا ہے۔ تاکہ اس سے یہ ظاہر کر سکیں کہ امامؑ نے واقعی دھوکہ کھایا ہے اور بلاوجہ عراق کی طرف تشریف لے گئے تھے۔

ان اعتراضات کا جواب

عراق کی طرف سفر کی ضرورت اور لزوم کے سلسلہ میں خود امامؑ کے جواب کا ذکر کرنے سے پہلے بہتر ہے کہ مقدمہ کے طور پر کچھ باتیں ذکر کر دی جائیں تاکہ امامؑ کا جواب پوری طرح واضح ہو سکے۔

ماضی وحال دونوں عہد کی سیاسی تاریخ کے مطالعہ سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ بہت کم ایسا اتفاق پیش آیا' جب کسی شخص کا سیاسی اقدام قطعی و یقینی بنیادوں پر اور بلا کسی خطر کے عملی صورت اختیار کر سکا ہو۔ جو لوگ اپنے اچھے یا برے مقاصد کے حصول کیلئے جدوجہد کرتے ہیں' ہمیشہ احتمالات کی بنیاد پر قدم بڑھاتے ہیں' دنیائے سیاست میں سب سے زیادہ کامیاب اور نیک و صالح افراد بھی ہمیشہ قتل جیسے خطرات سے دوچار رہتے ہیں۔ لہٰذا اس حقیقت کی موجودگی میں فکری بلند پروازی کے تحت یہ سوچنا درست نہیں کہ مقصد میں کامیابی کا یقین ہونے کی صورت ہی میں آگے بڑھنا چاہئے۔ یہ بات تاریخی حقائق سے بعید ہونے کے ساتھ ساتھ ان لوگوں کی سادہ لوحی کو بھی ظاہر کرتی ہے جو سیاسی امور میں یہ نظریہ رکھتے ہیں۔

یہاں اس انداز سے بھی سوچنا چاہئے کہ امامؑ کو اس سفر میں بہر حال صدفی صد اپنی کامیابی کا اطمینان کر لینا چاہئے تھا۔ جو شخص امامؑ کے اس سفر پر تشریف لے جانے کا طرفدار نہیں ہے اسے یہ تاریخی مثالیں پیش نہ کرنی چاہئیں کہ اس سفر میں شکست کا امکان بھی تھا کیونکہ اہل کوفہ اس سے پہلے بھی آزمائے جا چکے تھے۔ اور جو امامؑ کے اس سفر کا طرفدار ہے اسے یہ نہیں سوچنا چاہئے کہ اس سفر میں (ظاہری) شکست کا کوئی امکان ہی نہیں تھا۔

اس نکتہ کو مد نظر رکھتے ہوئے ان تمام حالات کے تحت امام حسینؑ کی پوزیشن پر غور کرنا چاہئے اس کے بعد سفر عراق کے سلسلہ میں تاریخی شواہد اور امامؑ کے ارشادات کا جائزہ لینا چاہئے۔

امام حسینؑ کسی بھی صورت میں یزید اور اس کی حاکمیت کی موافقت نہیں کرنا چاہتے تھے۔ چاہے اس مخالفت کے نتیجہ میں آپؑ شہید کیوں نہ کر دیئے جائیں۔ ساتھ ہی ساتھ آپؑ اس جستجو میں تھے کہ بصورت امکان یزید کے خالف انقلاب

برپا کر کے اسلامی معاشرہ کی باگ ڈور خود سنبھال لیں۔

یہ تھی "منشائے" امامؑ کی بنیاد۔ اسی بنیاد کے تحت آپؑ اپنی روش انتخاب فرماتے تھے، نیز لوگوں کے مشوروں اور اعتراضات پر رد عمل کا اظہار کرتے تھے۔ یہ بنیاد چونکہ کسی بھی صورت میں قابل تغیر نہیں تھی لہٰذا جو مشورہ بھی کسی نہ کسی طور پر اس سے ٹکراتا تھا امامؑ کی نظر میں غلط اور ناقابل قبول تھا۔

سیاسی نقطۂ نظر سے بھی اس زمانہ کی سیاسی دنیا ایک خاص کیفیت کی حامل تھی، جس کے ایک بڑے حصہ کو احتمالات پُر کرتے تھے اور امامؑ کو خود بھی اسی روش کے مطابق اس طرح چلنا تھا کہ نہ آپؑ کے منشاء کی بنیاد میں کوئی تبدیلی آنے پائے اور نہ کوئی عمل موجودہ حقائق کے خلاف ہو۔

موجودہ حقائق یہ تھے کہ یزید امام حسینؑ کو بیعت نہ کرنے کی صورت میں چین سے جینے نہ دیتا۔ کیونکہ ان حالات میں حسینؑ خود سکون سے بیٹھے نہ رہتے۔ لہٰذا یزید کا تنہا انتخاب، بیعت نہ کرنے کی صورت میں امامؑ کا قتل تھا۔ دوسری طرف شام تو اس کے تسلط ہی میں تھا۔ مکہ، مدینہ اور مجموعی طور پر پورے حجاز میں کہیں اس کا امکان نہیں تھا کہ یزید کے اس اقدام پر رد عمل کا اظہار ہوتا اور اس کا مقابلہ کیا جاتا۔ صرف ایک نقطہ اور وہ بھی احتمالی صورت میں امامؑ کی حفاظت کیلئے سپر کا کام بھی کر سکتا تھا اور یزید کے خلاف جنگ کیلئے ایک مضبوط محاذ بھی بن سکتا تھا اور یہ نقطہ عراق تھا۔ لیکن گزشتہ حالات کے پیش نظر اس کا احتمال بھی ضعیف تھا۔ مگر امامؑ سے اہل کوفہ کی درخواست نے اس احتمال کو تقویت بخشی اور جوں جوں دعوت کا اصرار بڑھتا گیا احتمال قوی ہوتا گیا۔ لیکن ابھی بھی اس میں گنجائش پائی جاتی تھی۔

اب آپ ہی بتائیں اگر امامؑ اس راہ کا انتخاب نہ کرتے تو کیا کرتے؟ کیا حسینؑ بیعت کر سکتے تھے؟ کیا یزید بیعت کئے بغیر حسینؑ کو زندہ رہنے دیتا؟ اگر حسینؑ

عراق نہ جاتے تو کیا آج ساری تاریخی کتابیں یہ نہ کہتیں کہ اگر آپؑ عراق جاتے تو یقیناً فاتح اور کامیاب ہوتے۔ آپؑ نے لوگوں کے خط کا مثبت جواب کیوں نہیں دیا اور ان کی دعوت کیوں قبول نہیں کی؟ حجاز میں یزید کے کارندوں کے ہاتھوں بے چون وچرا کیوں شہید ہو گئے اور اپنے تحفظ کیلئے کوئی اقدام کیوں نہیں کیا؟

ایسے اور اسی طرح کے بہت سے سوالات ہیں جو امامؑ کے اس روش کے انتخاب نہ کرنے اور کوفہ کا سفر اختیار نہ کرنے کی صورت میں ہر صاحب عقل و ہوش کے ذہن میں پیدا ہوتے۔

لیکن اعتراضات کئے گئے۔ بہت سے مواقع پر تو امامؑ سے قیام نہ کرنے کی فرمائش کی گئی۔ فطری طور پر جس کا مطلب یزید کی حکومت کو تسلیم کر لینا تھا۔ اور امامؑ کیلئے کسی طرح ممکن نہ تھا۔ حتی عبداللہ بن جعفر کی پیشکش بھی یہی مفہوم رکھتی تھی کیونکہ یزید سے امان حاصل کرنا طبعی و فطری طور پر امامؑ کے اقدام نہ کرنے پر مشروط ہوتا، جو امامؑ کیلئے قابل قبول نہ تھا۔ اب ہم دیکھیں کہ خود امامؑ کا جواب اور تاریخی شہادتیں ہمیں کیا بتاتی ہیں۔

امامؑ نے مختلف مواقع پر متعدد نکات کی طرف اشارہ فرمایا۔ ان میں سے ایک نکتہ یہ ہے کہ یزید اور اس کے کارندے مکہ میں مجھے زندہ نہیں رہنے دیں گے اور بہر حال قتل کر ڈالیں گے۔ آپؑ نے ابن عباس کو جواب دیتے ہوئے فرمایا: "لان اقتل خارجاً منھاً بشبرین احب الی من ان قتل خارجاً منھا بشبر"۔ (بلاذری ج ۲، ص ۱۶۷، طبری ج ۴، ص ۲۸۹، ابن اعثم ج ۵، ص ۱۱۳، ابن عساکر ص ۱۹۰، المعرف والتاریخ ج ۱، ص ۵۴۱، مجمع الزوائد ہیثمی، ج ۹ ص ۱۹۲، مروج الذہب، مسعودی ج ۳، ص ۵۵)

"مکہ سے ایک بالشت دور قتل ہونے سے زیادہ میں یہ پسند کروں گا کہ اس

سے دو بالشت دور قتل کیا جاؤں"۔ امامؑ کے اس فقرہ میں حرمت مکہ کے تحفظ کی طرف اشارہ کے علاوہ احتمالی طور پر یہ نکتہ بھی پایا جاتا ہے کہ جان کی حفاظت امام پر فرض ہے لہٰذا جس قدر جلد ممکن ہوا نھیں اس فریضہ پر عمل کرنا چاہئے۔

ابن عمر کے جواب میں بھی فرمایا: "ان القوم لا يتركوني......فلايزالون حتىٰ بايع واني كاره فيقتلونني"۔(؟)

"یہ قوم مجھے نہیں چھوڑے گی...... یہ لوگ اس پر اڑے ہیں کہ میں بیعت کرلوں اور میں اسے برا سمجھتا ہوں۔ اس لئے بیعت نہیں کروں گا۔ لہٰذا یہ لوگ مجھے قتل کردیں گے"۔ یہ جملہ اس وقت امامؑ کی کیفیت وحالت اور موجودہ حقیقت وواقعیت کو بخوبی واضح کردیتا ہے۔

امامؑ نے ایک دوسری جگہ فرمایا: "ولو كنت في حجرهامة من هوام الارض لاستخرجوني ويقتلونني"۔(ابن اعثم ج ۵، ص ۱۱۶)

جب آپؑ سے یہ دریافت کیا گیا کہ آپؑ اتنی عجلت اور جلدی کیوں فرمارہے ہیں تو فرمایا: "لولم اعجل لاخذت"۔(ابن اعثم ج ۴، ص ۲۹۰)

"اگر میں عجلت سے کام نہ لوں تو گرفتار کرلیا جاؤں گا"۔ آپؑ نے مزید فرمایا: "ان بني اميه اخذوا مالي فصبرت، وشتموا عرضي فصبرت، وطلبوا دمي فهربت"

"بنوامیہ نے میرا مال مجھ سے چھین لیا میں نے صبر کیا، میرے آمد سے تعرض کیا میں نے صبر کیا، جب مجھے قتل کرنا چاہا تو میں نے جلاوطنی اختیار کرلی"۔(ابن اعثم ج ۵ ص ۱۴۴)

یہ عبارت اس تلخ حقیقت کی شاہد ہے کہ بنوامیہ بہر حال حسینؑ کے قتل پر تلے بیٹھے تھے اور بغیر بیعت کئے زندہ رہنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔

دوسری طرف عراق جانے کا قضیہ ہے۔ جب یہ طے پایا کہ امامؑ مکہ سے روانہ ہوں گے تو ایسے میں انھیں کس خطۂ ارضی کا انتخاب کرنا چاہئے تھا؟ امامؑ نے جو چند ماہ مکہ میں قیام فرمایا تھا۔ اس دوران عراق سے پے در پے خط آپؑ کی خدمت میں پہنچے۔ یہ خطوط کچھ ایسے تھے جو بعد میں حضرتؑ کے سفرِ عراق کا اہم سبب قرار پائے اور بہت سے مواقع پر جب آپؑ کے سفر پر اعتراض کیا جاتا' امامؑ خطوں کا تذکرہ فرماتے تھے۔ (بلاذری 'انساب الاشراف' ج ۲ ص ۱۶۳۔۱۶۵)

جب آپؑ کا حر سے سامنا ہوا آپؑ نے ان ہی خطوں کا ذکر فرمایا۔ جب عمر سعد نے آپؑ سے عراق آنے کا سبب دریافت کیا تو امامؑ نے جواب میں انہی خطوط کی بات کہی۔ (بلاذری انساب الاشراف ج ۲ ص ۱۷۰' ۱۷۷' ابن اعثم ج ۵' ص ۱۳۷' ۱۳۸' دینوری اخبار الطّوال' ص ۲۴۹' ۲۵۴)

یحر بن شداد نے آپؑ سے سفر کی وجہ دریافت کی تو فرمایا: "ھذا کتب وجوہ اھل المصر"۔ (ابن سعد۔ بحوالہ تراثنا' ش ۱۰ ص ۱۷۳)

"یہ اس شہر کے بزرگوں اور سربرآوردہ افراد کے خطوط ہیں"۔ صبح عاشور بھی آپؑ نے آنے کی وجہ بیان کرتے ہوئے خطوں کا تذکرہ کیا۔

(ابن سعد۔ بحوالہ تراثنا' ش ۱۰ ص ۱۸۱)۔

عبداللہ بن عمر کو بھی وہ خط دکھلائے۔ (ابن عساکر ص ۱۹۳)

اور ہر مقام پر لوگوں کے اعتراضات کے جواب میں فرماتے تھے: "خلقی مملؤۃ بالکتب"۔ (ابن عساکر ص ۲۰۹' ۲۱۰)

"میرے گھوڑے کی خرجی ان خطوں سے بھری ہوئی ہے"۔

اس قدر وسیع پیمانہ پر خطوط کے ذریعہ امامؑ کو بلانا اس دعوت کو سنجیدہ بنا رہا تھا۔ خاص طور سے عوام کے ساتھ کوفہ کی بہت سی بزرگ شخصیتوں کے خطوط

بھی تھے۔ یہ افراد شیعوں کے علاوہ بہت سے دوسرے سربر آوردہ افراد بھی تھے۔ اور ہو سکتا ہے کہ اگر صرف شیعوں نے خط بھیجے ہوتے تو بات اتنی اہم اور سنجیدہ نہ ہوتی۔ کیونکہ ان کی تعداد ہی اتنی نہیں تھی۔ لیکن عام طور سے وسیع پیمانہ پر دعوت نے اس معاملہ کو اہم بنادیا تھا۔

اسی کے ساتھ یہ مسئلہ بھی تھا کہ اہل کوفہ دو مرتبہ یعنی آپؑ کے پدر بزرگوارؑ اور آپؑ کے بھائیؑ کے زمانہ میں آزمائے جاچکے تھے۔ اب امامؑ کس کا انتخاب کرتے۔ لوگوں کے ماضی کا یا ان کی موجودہ صورت حال کا؟

اپنی گزشتہ باتوں کے پیش نظر اگر ہم یہ بھی فرض کرلیں کہ امامؑ کیلئے کامیابی کا امکان ۵۰ فیصد سے بھی کم تھا تو کیا حضرتؑ کیلئے اس کے علاوہ کوئی دوسری راہ بھی تھی؟ تو صاف نظر آتا ہے کہ کوفہ میں کامیابی کا جس قدر احتمال و امکان تھا اتنا کہیں اور نہیں تھا۔

اس کی سب سے بہترین دلیل یہی خطوط ہیں جن سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ بہت سے لوگ نہ فقط آپؑ کی حفاظت پر آمادہ ہیں بلکہ دشمن سے جنگ کیلئے بھی کمر بستہ ہیں۔ اس کے علاوہ کسی اور علاقہ سے امامؑ کو آنے کی دعوت بھی نہیں دی گئی۔ پہلے مرحلہ میں جن لوگوں نے حضرتؑ کو خط لکھے وہ سلیمان بن صرد' مسیّب بن نجبہ' حبیب بن مظاہر' رفاعۃ بن شداد و...... جیسے شیعہ تھے' اس مرحلہ میں حضرتؑ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کے بعد خطوں کا ایک سیل مکہ کی جانب اُمڈ پڑا۔ یہی نہیں بلکہ ان جماعتوں کے نمائندے بھی مکہ گئے اور خود حضرتؑ کی خدمت میں اپنی درخواستیں پیش کیں۔ جو نامہ بھی مکہ آتا' اس میں بہت سے لوگوں کے دستخط اور نام لکھے ہوئے تھے۔ بعض روایات میں ان خطوں کی تعداد ۱۵۰ تک ذکر ہوئی اور بعض نے اس سے کم بھی لکھی ہے۔ اس کے باوجود امامؑ نے آخر تک ان خطوں کا

کوئی جواب نہ دیا۔ اور اس کے بعد بھی صرف اپنی طرف سے جناب مسلمؑ کو بھیجنے پر تیار ہوئے۔ (ابن اعثم ج ۵ ص ۴۶ ۴۹ ۵۰ ۵۱ طبری ج ۴ ص ۲۶۲)

امام حسینؑ نے لوگوں کی حمایت کا بخوبی جائزہ لینے کیلئے حضرت مسلمؑ بن عقیلؑ کو اپنا نمائندہ بنا کر کوفہ روانہ کیا۔ جو امامؑ کی نگاہ میں پورے طور سے قابل اعتماد شخص تھے۔ امامؑ نے اپنے ایک خط میں اہل کوفہ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

"انی بعثت الیکم اخی وابن عمی وثقتی من اھل بیتی مسلم بن عقیل وقد امرته ان یکتب الیّ بحالکم ورأیکم فقد موامع ابن عمّی وبایعوه ونصرو"۔

(ابن اعثم ج ۵ ص ۵۲ طبری ج ۴ ص ۲۶۲)

"میں نے اپنے بھائی، چچا کے بیٹے، اور اپنے اہل بیت میں سے قابل اعتماد شخص یعنی مسلم بن عقیل کو تمہاری جانب بھیجا اور انھیں حکم دیا ہے کہ تمہارے حالات مجھے لکھ بھیجیں۔ پس ان کی معیت اختیار کرو، ان کی بیعت کرو اور ان کی نصرت و مدد کرو"۔

جب مسلمؑ کوفہ پہنچے تو لوگ جوق در جوق آکر ان کی بیعت کرنے لگے۔ آپ ان تمام لوگوں کے نام لکھتے جاتے اور ان سے عہد لیتے تھے کہ بعد میں کوئی غدر و خیانت نہ کریں گے اور اپنے امامؑ کی حمایت و اطاعت کریں گے۔ جتنے لوگوں کے نام آپ نے لکھے ان کی تعداد بیس ہزار سے کہیں زیادہ تھی [۱]۔

جناب مسلمؑ نے یہ صورت حال دیکھ کر امام حسینؑ کی خدمت میں لکھا کہ:

"فانی اخبرك انه قد بایعك من اهل الکوفة نیف وعشرون الفاً فاذا

۱۔ (ابن اعثم ج ۵ ص ۶۸ طبری ج ۴ ص ۲۵۹ ابن عساکر ص ۲۰۷ مسعودی، مروج الذہب، ج ۳ ص ۵۴ (ان لوگوں نے تعداد ۱۲ ہزار لکھی ہے) لیکن قتیبہ نے الامامۃ والسیاسۃ ج ۲ ص...... میں یہ تعداد تیس ہزار لکھی ہے)

بلغك كتابي هذا فالعجل "۔(ابن سعد بحوالہ تراثنا'ش ۱۰'ص ۱۷۶ 'طبری ج ۴'ص ۲۸۱'ابن اعثم'ج ۵'ص ۷۷)

"بیس ہزار سے زیادہ افراد نے آپؑ کی بیعت کرلی ہے۔ جیسے ہی میرا خط آپؑ تک پہنچے آنے میں تعجیل فرمائیے"۔

کہتے ہیں کہ جس وقت امامؑ روانہ ہو رہے تھے اسی وقت مزید سو افراد کے نام حضرتؑ کی خدمت میں پہنچے جنہوں نے حضرت مسلمؑ کے ہاتھ پر بیعت کی تھی۔ (ابن سعد بحوالہ تراثنا'ش ۱۰'ص ۱۷۳)

اس خط کے جواب میں امامؑ کی روش کیا ہونی چاہئے تھی؟ آپؑ نے جب تک مسلمؑ کو نہیں بھیجا تھا ان خطوں کے سلسلہ میں ذرا بھی مطمئن نہ تھے۔ لیکن اب تو آپؑ کے نمائندہ کا خط بھی آپؑ تک پہنچ چکا تھا۔ یہ آپؑ کے اقدام کیلئے بہترین ثبوت تھا۔ لہٰذا جب آخری مرتبہ ابن عباس نے آپؑ کو کوفہ جانے سے روکنا چاہا تو آپؑ نے فرمایا: میں جانتا ہوں کہ آپ اہل نصیحت ہیں:

"ولكن مسلم بن عقيل كتب الي باجتماع اهل المصر علىٰ بيعتي ونصرتي وقد اجمعت على المسير اليه"۔

(مروج الذہب'مسعودی ج ۳'ص ۵۴'۵۵)

"مسلم نے میرے پاس خط لکھا ہے کہ کوفہ کے لوگوں نے آپؑ کی بیعت اور نصرت پر ایکا کرلیا ہے اور میں نے بھی سفر کا مصمم ارادہ کرلیا ہے"۔

ایک دوسری روایت میں ہے کہ مسلمؑ نے امامؑ کو لکھا:

"والناس كلّهم معك ليس لهم في آل معاوية راى ولا هوى"۔

"سب کے سب آپؑ کے ہمراہ ہیں اور آل معاویہ سے کسی طرح کا تعلق نہیں رکھتے"۔(طبری ج ۴'ص ۲۸۱)

یہ وہ حقیقت تھی جسے مسلمؑ نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ آپؑ پورے اطمینان سے ان حقائق کا مشاہدہ کرتے اور انھیں لکھ بھیجتے تھے۔ آپؑ دیکھ رہے تھے کہ واقعاً لوگوں کا بنو امیہ سے کوئی لگاؤ نہیں رہا' اب وہ آل علیؑ کے خواہاں ہیں۔ لیکن بعد میں ابن زیاد کے ظلم و ستم نے حالات کو ایکدم بدل کر رکھ دیا۔

جناب مسلمؑ سے متعلق واقعات کے ذیل میں ہم یہ بتائیں گے کہ اہل کوفہ نے شروع میں جناب مسلمؑ کی نہایت وسیع پیمانے پر حمایت کی تھی۔ تقریباً ۱۸ ہزار افراد ابن زیاد کے محل پر حملہ میں جناب مسلمؑ کے ساتھ تھے۔ مگر وہ جلد ہی متفرق ہو گئے اور جناب مسلمؑ کا ساتھ چھوڑ گئے۔ اس کا سبب وہی ان کے منفی عادات و خصلتیں نیز ابن زیاد کے کارندوں کا عوام فریب اور ظلم و تشدد تھا۔

(ابن اعثم ج ۵' ص ۷۸' مسعودی ج ۳' ص ۵۸)

بنو امیہ کیلئے کوفہ ایک چیلنج بن گیا تھا۔ کوفہ میں تعنیات ان کے جاسوسوں نے یزید کو لکھا کہ : ''قد بایع مسلم الترابیۃ''۔ (ابن اعثم ج ۵' ص ۶۰)

''ترابیہ' ابو تراب کی نسبت سے شیعوں کا نام یعنی شیعوں نے مسلم کی بیعت کرلی ہے''۔ ان جاسوسوں نے یزید سے درخواست کی کہ جلد از جلد کوفہ پر کنٹرول حاصل کیا جائے۔

عبید اللہ ابن زیاد اسی لئے کوفہ بھیجا گیا تھا۔ کیونکہ وہ سمجھ چکے تھے کہ اگر اب دیر کی تو کوفہ ہاتھ سے نکل جائے گا۔ خاص طور سے اس وقت کے حاکم نعمان بن بشیر نے نہ صرف عدم تعاون کا اظہار کیا تھا بلکہ ایک روایت کے مطابق یہ بھی کہا تھا کہ :

''لابن بنت رسول اللہ احب الینا من ابن بجدل''۔

(ابن قتیبہ 'الامامۃ والسیاسۃ' ج ۲' ص ۵)

''حضرت رسولؐ کی بیٹی کا فرزند ہمیں ابن بجدل سے زیادہ عزیز ہے''۔

یہ اشارہ یزید کی طرف تھا۔ ابن اعثم نے بھی نقل کیا ہے کہ جب مسلم کوفہ آئے تو نعمان اپنے محل میں تنہا رہ گیا تھا۔ کوئی شخص نماز جمعہ میں اس کے یہاں نہ آتا تھا۔ اسے لوگ خراج بھی نہیں دیتے تھے۔ کسی کو بلاتا تھا تو وہ آنے سے انکار کر دیتا تھا اور جو کچھ حکم دیتا تھا اس کی تعمیل نہیں کی جاتی تھی۔

(ابن اعثم ج ۵ ص ۴۸)

یہ تمام باتیں ظاہر کرتی ہیں کہ ابن زیاد کے آنے سے پہلے کوفہ بنوامیہ کیلئے سنگین صورت حال اختیار کر چکا تھا اور یہی موقع تھا جب امام حسینؑ اس سلسلہ میں کوئی اقدام فرماتے۔

واپسی کی تجویز اور اس کا موقع

امام حسین علیہ السلام تیزی کے ساتھ مکہ سے کوفہ کی جانب روانہ ہوئے۔ سفر تیزی سے طے ہوتا رہا۔ اور یہ سرعت رفتار حضرت مسلم کی شہادت کی خبر سننے تک قائم رہی۔ شہادت کی اطلاع ۱۰ ملنے کے بعد قافلہ کی رفتار سست پڑ گئی۔ امامؑ ان کے عزیزوں اور اصحاب کے درمیان باہم مشورے ہوئے۔ کہتے ہیں کہ امامؑ واپسی کا ارادہ رکھتے تھے۔ لیکن مسلم کے بھائی اس پر آمادہ نہ ہوئے۔ انہوں نے کہا کہ اپنے بھائی کے خون کا انتقام لینے کیلئے کوفہ جانا ضروری ہے۔ (بلاذری ج ۲، ص ۱۶۸، طبری ج ۴ ص ۲۹۲، طبقات ابن سعد بحوالہ تراثنا، ش ۱۰، ص ۱۶۷ ابن قتیبہ)

اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ انہوں نے یہی کہا ہو گا، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ کامیابی کی قطعی امید رکھتے تھے۔ اور اگر امام حسینؑ بھی سفر جاری رکھنے پر راضی ہوئے تو اس کا سبب بھی یہی تھا۔ یہ بات تسلیم کرنا عقلمندی نہیں ہے کہ یہ لوگ شکست کا

۱۰۔ دینوری نے اخبار الطوال ص ۲۴۷ میں لکھا ہے کہ قبیلہ بنو اسد کے دو افراد جو کوفہ سے آرہے تھے خبر لیکر آئے۔ فرزدق یا حر کے خبر دینے کی روایت قطعی غلط ہے۔ دیکھئے مروج الذہب، مسعودی ج ۳ ص ۶۱۔

یقین رکھنے کے باوجود اپنے بھائی کے خون کے انتقام کی فکر میں تھے۔ اگر ایسا ہوتا تو جس طرح امامؑ حر کے لشکر کے ساتھ کوفہ جانے پر آمادہ نہیں ہوئے تھے اسی طرح برادران مسلم کے اصرا کے باوجود وہیں سے کوفہ کی جانب سے اپنا رخ موڑ لیتے۔

شاید دوسروں نے بھی اس متوقع کامیابی کی تائید میں باتیں کہی ہیں۔ خاص طور سے یہ روایت نقل ہوئی ہے کہ کچھ لوگوں نے امامؑ سے کہا: آپؑ مسلم بن عقیلؑ نہیں ہیں۔ اگر اہل کوفہ آپؑ کو دیکھ لیں تو سب کے سب آپؑ کی طرف ہو جائیں گے۔ ان کا کہنے کا مطلب یہ تھا کہ شاید مسلم مشہور نہ ہونے کی بنا پر یا...... لوگوں کو اپنی طرف مائل کرنے سے قاصر رہے ہوں۔ لیکن آپؑ کی شخصیت کچھ اور ہی کشش رکھتی ہے۔ امامؑ اس وقت جن حالات سے دوچار تھے اہل کوفہ کی طرف سے دس سال سے آنے والے خطوط اور ان کی درخواستوں کو دیکھتے ہوئے یہ بات کچھ بعید نہیں تھی۔ لہٰذا ان باتوں کا جائزہ لینے کے بعد امامؑ نے سفر جاری رکھا۔ فتوح کی روایت سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ جو خط امامؑ نے اہل کوفہ کو اپنی طرف دعوت اور عہد پر قائم رہنے کیلئے قیس ابن مسہر کے ذریعہ بھیجا تھا، غالباً جناب مسلم کی شہادت کی خبر سننے کے بعد بھیجا تھا۔

(طبری، ج ۴، ص ۳۰۰، ابن اعثم ج ۵، ص ۳۰۴)

اگرچہ امامؑ کے قافلہ میں اہل کوفہ سے متعلق شکوک و شبہات پیدا ہونے لگے تھے لیکن عملی طور پر واپسی کی تجویز کی صورت میں اس کا اظہار اس وقت ہوا جب امامؑ کا سامنا حر کے لشکر سے ہوا۔

حر کے لشکر کا آنا قادسیہ میں دشمن کے چار ہزار سپاہیوں کی موجودگی کی خبر، کوفہ میں اب تک گزرے ہوئے حالات (منجملہ ابن سعد کے قاصد کا یہ پیغام لے کر آنا کہ مسلم نے مجھ سے وصیت کی تھی کہ آپ واپس چلے جائیں) ان تمام باتوں

نے امامؑ کو مطمئن کر دیا کہ اب کوفہ جانا بالکل نامناسب ہے۔ اب وہاں جانے کا مطلب سوائے شہادت کے اور کچھ نہیں ہے۔ مسلم نے لوگوں کے ساتھ چھوڑ دینے اور اپنی گرفتاری سے اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ اب کوفہ کے حالات امامؑ کے حق میں نہیں ہیں۔ انہوں نے کوشش کی جس طرح امامؑ کو یہاں آنے پر آمادہ کیا تھا یوں ہی ایک پیغام کے ذریعہ کسی طرح انھیں آنے سے روک بھی دیں۔ لہٰذا شہادت کے وقت عمر بن سعد سے جو قریشی تھا وصیت کی کہ کسی کے ذریعہ یہ پیغام امامؑ تک پہنچادے۔

امامؑ تک یہ پیغام پہنچنے اور حر کے لشکر کا سامنا ہونے میں کوئی زیادہ فاصلہ نہیں تھا۔ یہ سارے واقعات عراق کی سرزمین پر پیش آئے۔ امامؑ نے ۸ /ذی الحجہ کو مکہ سے سفر شروع کیا تھا اور اب ماہ ذی الحجہ تمام ہو چکا تھا اور محرم کا آغاز تھا۔ اس کے باوجود امامؑ نے واپسی کا ارادہ کیا۔ لیکن سب سے بڑی رکاوٹ حر تھا۔ اسے مامور کیا گیا تھا کہ امامؑ کو کوفہ کی طرف لے جائے۔ امامؑ جواب کوفہ کے حالات سے پوری طرح آگاہ ہو چکے تھے جانے پر آمادہ نہ ہوئے۔ حر چونکہ جنگ کیلئے مامور نہیں تھا لہٰذا اس سے بچنے کیلئے اس پر تیار ہو گیا کہ امام حسینؑ کو کربلا کی طرف لے جائے۔ ایسی خشک سرزمین جہاں سے نہ حجاز کی طرف واپسی ممکن اور نہ کوفہ کی طرف جانے کا امکان۔ (بلاذری ج ۲ ص ۱۷۰، ابن اعثم ج ۵، ص ۱۳۹)

اس سے صرف نظر کرتے ہوئے کہ عملی طور پر کیا ہوا، امامؑ نے حر کے بعد ہی اپنی واپسی کی تجویز پیش کی تھی اور ان لوگوں سے کہا تھا کہ ہمیں واپس جانے دیا جائے۔
(بلاذری ج ۲ ص ۱۷۰، ابن اعثم ج ۵، ص ۱۳۵، دینوری، اخبار الطوال ص ۲۵۰)

بعد میں آپؑ نے ابن سعد کے سامنے بھی یہی تجویز رکھی۔
(طبری ج ۴، ص ۳۱۱، ابن اعثم ج ۵، ص ۱۵)

اور لوگوں سے بارہا فرمایا:

"ایھاالناس اذا کرھتمونی فدعونی انصرف عنکم الی مأمن الارض"۔

"اے لوگو! اگر تمہیں مجھ سے کوئی لگاؤ نہیں ہے مجھے چھوڑ دو تاکہ سرزمین امن یعنی مکہ کی طرف واپس چلا جاؤں"۔

(طبری ج ۴ ص ۳۲۳)

بعض راویوں نے لکھا ہے کہ امامؑ نے واپسی کے سلسلہ میں تین تجویزیں رکھی تھیں۔ ایک حجاز کی جانب واپسی، دوسرے شام کی جانب اور تیسرے شرق السلاح یعنی مشرق میں اسلامی سرحدوں کی جانب۔ لیکن مذکورہ بالا روایت اور دوسرے مقامات پر بھی اسی طرح کی وضاحت سے یہ بات صاف نظر آتی ہے کہ امامؑ نے شام جانے کا ارادہ ظاہر نہیں کیا تھا۔ بلکہ صرف حجاز یعنی (مکہ یا مدینہ) جانے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ بلاذری نے صراحت کے ساتھ یہ روایت نقل کی ہے کہ امامؑ نے عمر بن سعد سے صرف مدینہ کی جانب واپسی کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ (بلاذری ج ۲، ص ۱۸۳)

یوں ہی عقبہ بن سمعان سے بھی مستند طور پر یہ روایت نقل ہوئی ہے اس نے کہا: میں تمام مراحل میں حسینؑ بن علیؑ کے ہمراہ تھا، لوگ یہ کہتے ہیں کہ امامؑ نے ' (معاذاللہ) فرمایا تھا مجھے شام جانے کی مہلت دیدو تاکہ میں جاکر یزید کے ہاتھ پر بیعت کرلوں، لیکن میں کہتا ہوں کہ آپؑ نے کسی مرحلہ پر اشارۃً بھی اس کا اظہار نہیں فرمایا۔ آپؑ فقط یہ کہتے تھے:

"دعونی ارجع الی المکان الذی اقبلت منہ، اودعونی اذھب فی ھٰذہ الارض العریضیة حتی انظر الی مایصیرالیه امرالناس"۔

"مجھے چھوڑ دو تاکہ جہاں سے آیا ہوں وہیں واپس چلا جاؤں، یا مجھے چھوڑ و

تاکہ میں خدا کی اس وسیع و عریض زمین میں کہیں چلا جاؤں۔ اور دیکھوں حالات زمانہ کیا رخ اختیار کرتے ہیں"۔ (ابن اثیر ج ۴' ص ۵۴)

لیکن لوگوں نے امامؑ کو اجازت نہیں دی۔ شاید شام جانے اور یزید کے ہاتھ بیعت کرنے کی بات یا تو ایسا جھوٹ ہے جسے امویوں اور ان سے وابستہ افراد نے گڑھ لیا ہے۔ یا پھر تقیہ ہے جس کا اظہار امامؑ نے ابن زیاد سے نجات حاصل کرنے کیلئے فرمایا ہو۔ یا پھر اسی سے ملتی جلتی کوئی چیز۔ ورنہ یہ تمام مشکلات و مسائل تو یزید کی بیعت سے انکار کا ہی نتیجہ تھے' لہٰذا یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ ان حالات میں امامؑ ایسی خواہش کا اظہار فرمائیں۔ اور ایسی خواہش ظاہر کرنے کے بعد بھی یزیدی آپؑ کو قتل کر دیں۔

شب عاشور اور جنگی کامیابی کا ہلکا سا امکان

امام حسینؑ کا اہل بیتِ عصمت و طہارتؑ کو اپنے ہمراہ لانا' اس سے قطع نظر کہ مقدرات الٰہی میں سے تھا یا آپؑ کی شہادت کے بعد آپؑ کی سیاسی فتح و کامرانی کا باعث بنا۔ اہل بیتؑ کی آمد کا سیاسی نقطۂ نظر سے جائزہ لینے کے بعد صاف ظاہر ہوتا ہے کہ امام حسینؑ یزید کو تخت سلطنت سے اتار کر اسلامی حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لینے کا مصمم ارادہ رکھتے تھے۔ حتیٰ اہل بیتؑ کا مکہ سے کوفہ کی جانب منتقل کیا جانا' سیاسی طور سے آپؑ کے اس اطمینان کی حکایت کر رہا تھا جو اہل کوفہ کی طرف سے آپؑ کی اطاعت کا اظہار کا نتیجہ تھا۔ اس بنا پر اہل حرم کو حجاز ہی میں چھوڑنا' سیاسی نقطۂ نظر سے امامؑ کیلئے قرین مصلحت نہیں تھا کیونکہ عراق کے آپؑ کے زیر نگیں آنے کی صورت میں ہو سکتا تھا کہ حجاز پر امویوں کا قبضہ باقی رہتا اور ایسی صورت میں یہ سوچا جا سکتا ہے کہ بنو امیہ امامؑ کے اہل بیتؑ پر مصائب و آلام کے پہاڑ توڑتے۔

اس حصہ کا آخری نکتہ یہ ہے کہ مسعودی نے لکھا ہے: جب امام حسینؑ

سر زمین کربلا پہنچے تو پانچ سو سوار اور ایک سو پیادے آپؑ کے ہمراہ تھے۔

(مسعودی مروج الذہب، ج ۲، ص ۶۱)

یہ افراد ان آٹھ دنوں کے دوران اور خاص طور سے شب عاشور جبکہ جنگ یقینی ہو چکی تھی امامؑ کو چھوڑ کر چلے گئے۔ اگر چہ اس کا احتمال ہے کہ مسعودی کی نقل کردہ تعداد سے کم ہی افراد رہے ہوں لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ اس دوران کچھ افراد امامؑ کو چھوڑ کر چلے گئے۔

امام حسینؑ نے شب عاشورا اپنے اصحاب سے فرمایا: کل روز شہادت ہے:

"فانتم فی حلّ منی وھٰذہ الیل قد غشیکم فمن کانت له منکم قوۃ فلیضم رجلا من اھل بیتی الیه وتفرقوا فی سوادکم حتی یاتی الله بالفتح اوامر من عندہ فیصبحوہ علی ماسروا فی انفسھم نادمین"۔ (ابن سعد، تراثنا، ش ۱۰، ص ۱۸۰)

"تم سب میری طرف سے آزاد ہو۔ اس رات کی تاریکی نے تمہیں اپنے دامن میں چھپالیا ہے، پس تم میں سے جو طاقتور ہو میرے اہل بیت میں سے ایک ایک کو اپنے ہمراہ لیکر سر زمین سے دور ہو جائے۔ یہاں تک کہ خداوند عالم ہمیں فتح و کامرانی سے ہمکنار کرے، یا خدا کا کوئی دوسرا حکم جامۂ عمل پہنے۔ اور ان افراد کو اپنے ان ارادوں سے پشیمان نہ کرے جس کا انہوں نے دل میں ارادہ کر رکھا ہے"۔

یہاں اس نکتہ کی طرف ایک ہلکا سا اشارہ ملتا ہے کہ ممکن ہے ان افراد کو کامیابی حاصل ہو یا پھر دشمن اپنے ارادہ سے پھر جائے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس مرحلہ پر بھی سیاسی اعتبار سے کامیابی یا دشمن میں کسی تغیر کا ضعیف سا امکان پایا جاتا تھا۔ اگر چہ سب کو یہ یقین ہو چکا تھا کہ کل شہادت سے ہمکنار ہوں گے۔

امامؑ کی بصیرت افروز تقریر کے بعد حر کا لشکر امامؑ میں آنا اور ان کے علاوہ بیس یا تیس افراد کا فوج یزید سے ٹوٹ کر امامؑ کی طرف آنا یہ ظاہر کر رہا تھا کہ اس طرح کے تغیر وانقلاب کا امکان پایا جاتا تھا۔ (ابن سعد' بحوالہ تراثنا' ش ١٠' ص ١٧٨' ١٨١' الامامۃ والسیاسۃ' ابن قتیبہ' ج ٢ ص ٧)

لیکن عمر بن سعد کی خباثت' جس کا باپ قاعدین ١ میں سے تھا' آج وہ اپنی خباثت کی بنا پر بنو امیہ کے آلہ کاروں میں شامل ہو گیا اور شمر ذی الجوشن ٢ جیسے خوارج کے ساتھ مل کر نیز ابن زیاد کے دباؤ میں آ کر وہ دنیا کے اس بہیمانہ ترین ظلم کا باعث ہوا' اور اگر چہ اس کا یہ عمل بظاہر تھوڑے عرصہ کیلئے فاسقین کی خوشنودی کا باعث بنا لیکن یہی قربانیاں خداوند عالم کے حکم سے ضامن تاریخ محمد و علوی اسلام کی پربار حیات بن کر رہ گئیں۔

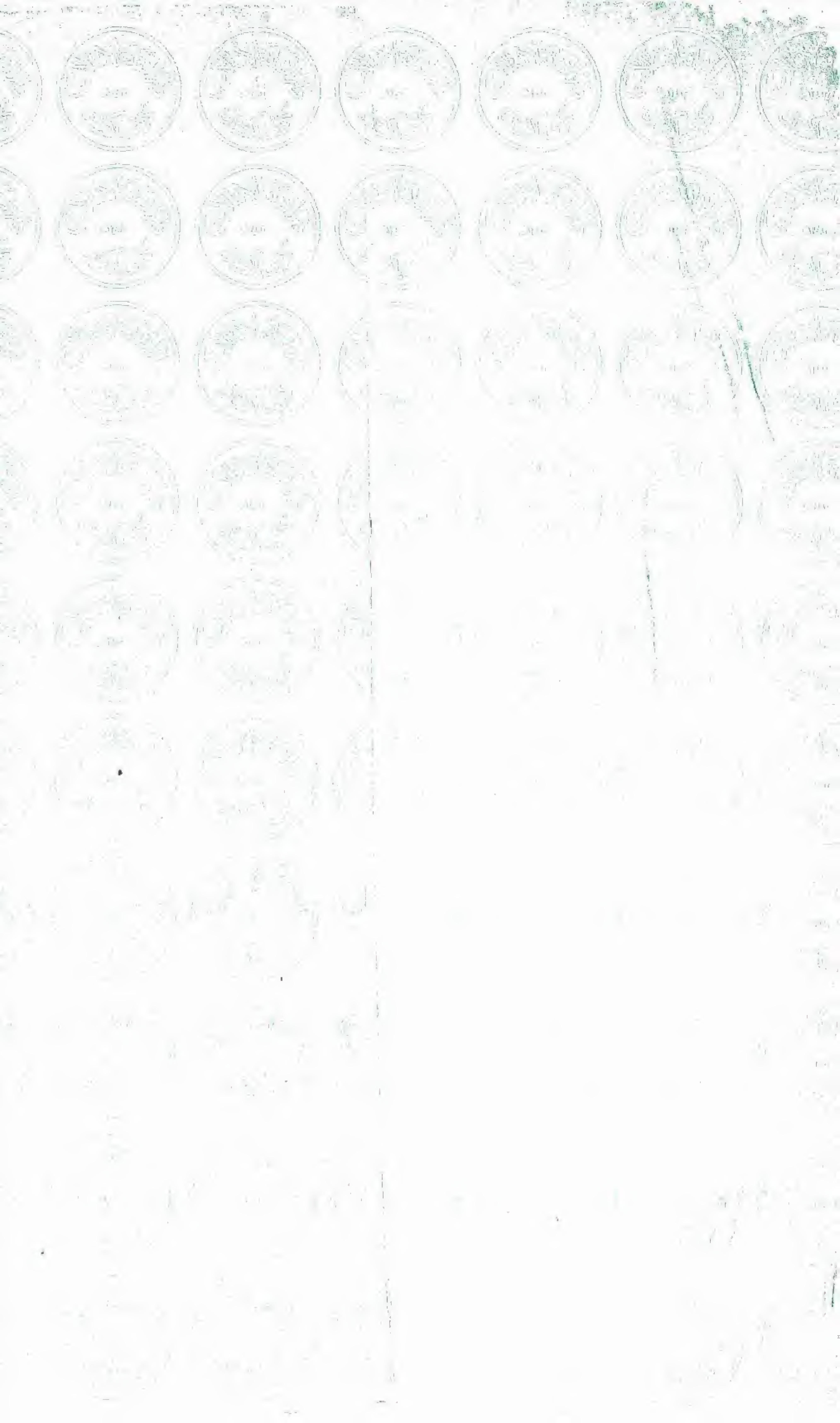
١۔ وہ لوگ جنہوں نے حضرت علی علیہ السلام کی تعبیر کے مطابق خذلوا الحق ولم ینصروا الباطل "حق کو خوار کیا اگر چہ باطل کی مدد بھی نہیں کی۔

٢۔ شمر ایک زمانہ سے خوارج کے افکار کا حامل تھا۔

فہرست مضامین

مضامین	صفحہ نمبر





مجاہد اعظم

کتاب مجاہد اعظم، کتب خانہ امام حسینؑ میں مدفون یا گمشدہ کنز مخفی میں ایک گراں بہا خزینہ ہے۔ خدا نے یومئذٍ تحدث اخبارھا کے مصداق اس گوہر گراں بہا کو امت اسلامی کے اس پر آشوب دور میں اپنی الطاف و عنایت سے روئے زمین پر ظاہر فرمایا ہے۔ یہ کتاب کیا ہے؟ حیات و قیام امام حسینؑ سے متعلق فریقین کی کتابوں کا ماخوذ خلاصہ و مغز ہے۔ یہ کتاب مولا امیر المومنینؑ کے اس قول کا مصداق ہے جسمیں آپؑ نے فرمایا: ”میں تمہارے بیان سے کمتر ہوں لیکن تمہارے خیال سے بالاتر ہوں“۔ یعنی یہ نادان عزاداروں کی طرف سے شامل کردہ ملاوٹوں، خام خیالیوں، وہمیات اور خوابوں سے پاک و منزہ عزاداری کی علمبردار اور قیام و عزائے حسینی کے بارے میں کئے جانے والے شکوک و شبہات سے بالاتر ہو کر باطل کو چیلنج کرنے والی کتاب ہے۔

ملت تشیع جس خطرناک صورت حال سے دوچار ہے اگر اس سے نجات حاصل کرنا چاہتی ہے تو چاہئے کہ اس کتاب کو شائع کیا جائے، اس کا مطالعہ کیا جائے اور اسے سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ ہمیں یقین ہے کہ یہ کتاب امت اسلامی کو فرقہ واریت کی لعنت سے نجات دلانے، وطن اسلامی کے خلاف برسر پیکار استعماری ایجنٹوں سے مقابلہ کرنے، مراکز دینی کے حقوق کی ادائیگی اور حقوق شرعیہ سے ملنے والے لقمہ کو حلال کرنے میں حد درجہ ممد و معاون ثابت ہوگی۔ ہم امید کرتے ہیں کہ اس کتاب کو معاشرے میں جاری و نافذ کیا جائے گا تاکہ موجودہ صورت حال سے گلو خلاصی ہو سکے۔

ہمارے علم کے مطابق بر صغیر پاک و ہند میں قیام و حیات امام حسینؑ پر لکھی گئی کتب میں واحد کتاب ہے جسمیں امت اسلامی کے تمام فرقوں کے احترام کو خاطر میں رکھا گیا ہے۔

مجلس تحقیق و ترویج حیات، قیام و عزائے امام حسینؑ